اسلام کے محافظوں سے یہ توقع نہیں تھی

چند پیسوں کے خاطر مجھے ''تحفہ،، بنا کر پیش کر دیا جائے گا

پاکستان میں طالبان کے آخری سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کی روداد ابتلاء

فدا محمد عدیل

امریکی عقوبت خانے گوانتاناموبے میں مجاہدین کے ساتھ کس طرح کا ظلم توڑا جا رہا ہے' اس حوالے سے واقعات سامنے آتے رہے ہیں لیکن سب سے شرمناک بات یہ ہے کہ اسلام کے خلاف عالمی جنگ میں پاکستان کی فوجی حکومت فرنٹ لائن اسٹیٹ کا کردار بڑے فخر کے ساتھ ادا کر رہی ہے۔ جنرل پرویز مشرف کی خودنوشت سے ایک بات اور کھل کر سامنے آ گئی کہ مجاہدینِ اسلام کو چند ڈالروں کے عوض فوجی حکمرانوں نے بیچ ڈالا۔ طالبان رہنماؤں اور القاعدہ کے نام پر بے شمار لوگ پنجروں میں بند کر کے صلیبیوں کے حوالے کر دیے گئے۔ اس کام میں کسی بھی طرح کی اخلاقیات کا خیال بھی نہیں رکھا گیا۔

ملا عبدالسلام ضعیف طالبان دور میں اسلام آباد میں افغانستان کے سفیر تھے' وہ ملا عمر کی حکومت کے سقوط تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اب بھی پاکستان کو بڑا بھائی قرار دیتے ہیں مگر پاکستان کیلئے وہ قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ پاکستانی حکام نے ان کو امریکا کے خونخوار پنجوں میں دیا تو یہ اقدام ان کیلئے حیران کن اور انوکھا نہیں تھا۔ ملا ضعیف تین سال اور دس مہینے گوانتاناموبے اور افغانستان کے عقوبت خانوں میں اپنے سینے پر وقت کے جابروں کی ضربیں سہتے رہے۔ اس عذاب سے رہائی کے بعد ان کی دل ہلا دینے والی داستان کتابی صورت میں منظر عام پر آئی ہے۔ پشتو زبان میں تحریر کی گئی ان کی کتاب میں ایسے ایسے روح فرسا واقعات بیان کیے گئے ہیں جنہیں پڑھ کر دل دہل جاتا ہے۔ بدنام زمانہ امریکی عقوبت خانہ گوانتاناموبے پچھلے کئی برسوں سے عالمی سطح پر جمہوری' قانونی اور سیاسی حلقوں اور انسانی حقوق کے کارکنوں کی شدید تنقید کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ گوانتاناموبے میں قیدیوں سے روا رکھے جانے والے مظالم کی کچھ جھلکیاں مختلف راویوں کی زبانی پہلے بھی سامنے آ چکی ہیں' مگر یہ پہلا موقع ہے کہ ایک اہم اور ذمہ دار طالبان لیڈر نے اس حوالے سے نہایت مفصل اور جامع کتاب تحریر کی ہے۔ روزنامہ ایکسپریس کے شکریے کے ساتھ ملا عبدالسلام ضعیف کی پشتو کتاب کی تلخیص پیش کر رہے ہیں۔

یہ 2 جنوری 2002ء کی صبح تھی' پاکستان میں سال نو کی تقریبات اختتام پذیر ہو چکی تھیں۔ میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ معمول کی زندگی گزار رہا تھا اور ہر وقت افغانستان میں رہنے والے گمشدہ بھائیوں اور شہیدوں کی فکر میں مبتلا رہتا تھا۔ میں ان کی قسمت پر کڑھتا تھا مگر اپنی تقدیر سے لاعلم تھا۔ تقریباً 8 بجے کا وقت تھا' گھر کے محافظوں نے اطلاع دی کہ چند پاکستانی سرکاری اہلکار آپ سے ملنے آئے ہیں۔ مہمانوں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھایا۔ یہ تین افراد تھے' ان میں ایک پختون اور باقی دو اردو بولنے والے تھے۔ میں نے افغان روایات کے مطابق تینوں مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور چائے بسکٹ سے تواضع کی۔ میں متجسس تھا کہ وہ کیا پیغام لے کر آئے ہیں؟ اردو بولنے والے ایک سیاہ رنگ کے موٹے کلین شیو شخص نے جس کے چہرے سے نفرت اور تعصب ٹپکتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے دوزخ کا ایلچی ہو' بظاہر بڑے مؤدبانہ انداز میں بات شروع کی اور پہلا جملہ یہ ادا کیا

"Your Excellency you are no more Excellency"

پھر وہ شخص بولا ''آپ جانتے ہیں کہ امریکا بہت بڑی طاقت ہے اور کوئی اس کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا' نہ ہی کوئی اس کا حکم ماننے سے انکار کی جرأت کر سکتا ہے' امریکا کو آپ کی ضرورت ہے تاکہ آپ سے پوچھ گچھ کی جا سکے۔ ہم آپ کو امریکا کے حوالے کرنے آئے ہیں تاکہ اس کا مقصد بھی پورا ہو اور پاکستان کو بھی بڑے خطرے سے بچایا جائے۔'' میں نے بحث شروع کر دی اور کہا کہ چلو مان لیا امریکا ایک سپر طاقت ہے لیکن دنیا کے کچھ قوانین اور اصول بھی تو ہیں' جن کے تحت لوگ زندگی گزارتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ کن مروجہ اسلامی یا غیر اسلامی قوانین کے تحت مجھ سے یہ بدسلوکی کی جا رہی ہے؟ آپ کس کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ مجھے میرے سوالوں کا جواب دیں اور مجھے اتنی مہلت دیں کہ میں آپ کا ملک پاکستان چھوڑ دوں۔ میری باتوں پر اس نے غراتے ہوئے کہا ''آج ہمیں اسلام یا قانون نہیں پاکستان کے مفادات عزیز ہیں۔'' میں نے یہ بات سنی تو سمجھ گیا کہ اب کوئی دلیل اور عذر کام نہ آ سکے گا۔ خاموشی اختیار کرنے سے قبل صرف اتنا کہا کہ جو آپ کی مرضی ہے کریں۔ ہم بے بس اور مجبور لوگ ہیں' سوائے خداوند قدوس کے کوئی دوسرا آسرا اور امید نہیں۔ وہی ہمارا حامی و ناصر ہو۔ یہ سن کر اس شخص نے کہا کہ آپ 12 بجے تک گھر میں رہیں گے اس کے بعد آپ کو پشاور لے جایا جائے گا۔ میری رہائش گاہ کو چاروں طرف سے محاصرے میں لے لیا گیا تھا اور باہر جانے کا کوئی راستہ تھا نہ ہی کوئی امید۔ ٹیلی فون کے ذریعے پاکستان کے دفتر خارجہ سے رابطہ کیا مگر سوائے خاموشی کے کچھ ہاتھ نہ آ سکا۔

پھر وہ لمحہ بھی آیا جب مزید سرکاری حکام آئے اور حکم شاہی صادر کیا کہ آپ کو پشاور منتقل کیا جا رہا ہے جہاں آپ ہمارے مہمان رہیں گے اور امریکی آپ سے صرف پوچھ گچھ کریں گے۔ ہو سکتا ہے دس دن بعد آپ گھر واپس آ جائیں۔ یہی اطمینان میرے اہل و عیال کو بھی دلایا گیا اور مجھے یقین دلایا گیا کہ جب تک میں ان کا ''مہمان'' ہوں میرے خاندان کی رہائش اور خوراک وغیرہ کا بندوبست کیا جاتا رہے گا۔ میرا یہ سب کچھ ادھر ہی رہ گیا۔ میرے پاس دس مہینے کا ویزہ تھا اور حکومتِ پاکستان کا یہ رسمی اجازت نامہ بھی کہ میں اُس وقت تک پاکستان میں قیام کر سکتا ہوں جب تک افغانستان کے حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے' جبکہ اقوام متحدہ کا وہ لیٹر بھی تھا جس میں پاکستانی حکام کو کہا گیا تھا کہ یہ (ملا عبدالسلام ضعیف) اہم شخصیت ہیں ان کا احترام ہونا چاہئے۔

لگ بھگ 12 بجے کا وقت تھا جب تین گاڑیاں آئیں اور مسلح اہلکاروں نے گھر کا محاصرہ کر کے راستے اور لوگوں کی آمد و رفت کو بند کر دیا۔ اُس وقت میڈیا کے لوگوں کو بھی مجھ سے ملنے کی اجازت نہ دی گئی۔ مجھے باہر نکلنے کو کہا گیا۔ میں ایسے حال میں گھر سے نکلا جب میرے بیوی بچے چیخ و پکار کر رہے تھے۔ میں اپنے بچوں کی طرف مڑ کر نہ دیکھ سکتا تھا کیونکہ میرے پاس ان کیلئے تسلی کا ایک لفظ بھی نہ تھا۔

''اسلام کے محافظ'' پاکستانی حکام سے مجھے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ مجھے چند پیسوں کی خاطر امریکا کو ''تحفہ'' بنا کر پیش کر دیا جائے گا۔ میں اس فکر میں گھر سے نکلا کہ اتنا ظلم کیوں ہو رہا ہے؟ کہاں گئی جمہوریت اور کہاں گئے انسانی حقوق؟ مقدس جہاد کی باتیں کرنے والوں کو آخر کیا ہو گیا؟ مجھے ایک گاڑی میں درمیان میں بٹھایا گیا۔ گاڑی کے شیشے کالے تھے جن کے آر پار کچھ نہ دیکھا جا سکتا تھا۔ ہماری گاڑی کے آگے سیکورٹی کی گاڑی تھی جبکہ تیسری گاڑی ہمارے پیچھے تھی جس میں مسلح اہلکار تھے۔ مجھے پشاور روانہ کیا گیا۔ راستے میں نسوانی آواز میں گانے سنائے جاتے رہے تاکہ مجھے تنگ کیا جائے اور ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا جائے۔ میں نے راستے میں ظہر کی نماز پڑھنا چاہی جو قضا ہونے کے قریب تھی مگر کہا گیا کہ پشاور میں پڑھ لو گے۔ میرے بار بار مطالبے پر بھی پروا نہیں کی گئی۔ پشاور پہنچے تو ایک دفتر نما جگہ لے جایا گیا۔ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ کون سی جگہ تھی۔ مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا جو خوبصورت میز اور کرسیوں سے سجا تھا۔ کمرے میں قائداعظم کی تصویر تھی جبکہ میز پر پاکستانی جھنڈا لگا ہوا تھا' سامنے گھومنے والی کرسی پر پاکستانی شلوار قمیض میں ملبوس ایک میانہ قد پختون بیٹھا مسلسل کرسی میں گھومے جا رہا تھا۔ اس نے مجھے خوش آمدید کہا اور اپنا تعارف دفتر کے سربراہ کے طور پر کرایا۔ اس نے کہا کہ ''آپ ہمارے ایسے مہمان ہیں جن کے آنے پر ہم بہت خوش ہوئے ہیں۔'' میں ان الفاظ کے معانی جاننے سے قاصر تھا مگر لگتا تھا کہ وہ شخص ٹھیک کہتا تھا' شاید وہ خوش اس لئے تھا کہ اس کو میرے فروخت کرنے کے عوض بہت اچھا معاوضہ ملنے والا تھا۔ انسانوں کے سوداگروں کیلئے ڈالروں کے بدلے کسی مسلمان کا سودا جائز اور عین ''جہاد'' ہے۔

یہاں میں نے نماز پڑھی۔ دفتر کے سربراہ نے چائے پلائی اور کھانا کھلایا۔ پھر مجھے ایسے کمرے میں لے جایا گیا جو قیدیوں کیلئے مخصوص تھا۔ نسبتاً اچھا کمرہ تھا جس میں گیس' بجلی کی سہولت تھی جو سردی کو روکتی تھی' باتھ روم تھا جہاں پانی وافر مقدار میں تھا۔ اچھی خوراک دی گئی' قرآن پاک کا نسخہ اور قلم کتابچہ بھی دیا گیا' ایک پہرے دار کو مجھ پر نظر رکھنے پر مامور کر دیا گیا جس سے جو مانگتا' دے دیتا تھا۔ تفتیش وغیرہ کا سلسلہ نہ تھا البتہ ایک شخص بار بار آتا جو عہدیدار معلوم ہوتا تھا' پشتو نہیں جانتا تھا۔ مجھے اردو نہیں آتی تھی۔ اس نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا:

What Will Happend

(کیا ہونے والا ہے؟)

میں نے جواب دیا: اللہ جانتا ہے' میں نہیں جانتا۔

اس دوران حکام آتے' اچھے طریقے سے سلام دعا کرتے اور مجھے احترام دیتے' باتیں نہیں کرتے تھے مگر صاف دکھائی دیتا کہ جب مجھے دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آتے اور واپس پلٹ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص کمرے میں آیا' بہت احترام دیا پھر اچانک بلک بلک کر رونے لگا۔ اتنا رویا کہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کو اٹھا کر باہر لے جایا گیا جس کے بعد کوئی کمرے میں نہیں آیا۔ چار گھنٹے بعد مجھے امریکیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ اس واقعے سے پہلے میں نے دو راتیں اسی کمرے میں گزاریں۔ تیسری رات 11 بجے کے قریب میں نے سونے کا ارادہ کیا کہ اچانک دروازہ کھلا اور شلوار قمیض میں ملبوس چھوٹی ڈاڑھی والا ایک شخص اندر داخل ہوا اور خیریت دریافت کرنے کے بعد پوچھا کیا ہونے والا ہے؟ میں نے لاعلمی ظاہر کی' پھر اس نے کہا ہم آپ کو دوسری جگہ منتقل کر رہے ہیں۔ میں نے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے کیونکہ مجھے سچ کی امید نہیں تھی۔ مجھے واش روم استعمال کرنے کیلئے پانچ منٹ دیے گئے۔ ٹھیک دس منٹ بعد کمرے سے نکال کر پہلی بار ہتھکڑیاں لگائی گئیں اور آنکھوں پر کالی پٹی باندھی گئی' جیبوں کی تلاشی لی گئی اور ڈیجیٹل ڈائریکٹری' پاکٹ سائز قرآن مجید کا نسخہ اور کچھ رقم لے کر مجھے دھکے دے کر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھے افراد خاموش تھے' کوئی کچھ نہ بول رہا تھا۔ گاڑی نے حرکت کی اور لگ بھگ ایک گھنٹے بعد میں نے ہیلی کاپٹر کی آواز سنی۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ ہیلی کاپٹر امریکی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ گاڑی ہیلی کاپٹر کے قریب ہوتی گئی اور اس کی آواز کانوں کو پھاڑنے لگی۔ اس دوران مجھے ضرب پڑی اور میری کلائی پر بندھی قیمتی گھڑی اس ضرب کے نتیجے میں گر گئی یا مجھ سے لے لی گئی۔ ہیلی کاپٹر کے قریب پہنچ کر مجھے دو افراد کی مدد سے گاڑی سے اتارا گیا اور ہیلی کاپٹر سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا۔ چند لمحوں بعد میں نے ''خدا حافظ'' کے الفاظ سنے۔ یہاں مجھے پوری طرح یقین ہو گیا کہ میں امریکیوں کے حوالے کر دیا گیا ہوں۔

امریکیوں کو حوالگی

''خدا حافظ'' کے الفاظ سننے کے بعد میں نے کچھ لوگوں کی آوازیں سنیں جو انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر اچانک وہ لوگ ریچھوں کی طرح مجھ پر حملہ آور ہو گئے اور مجھ پر لاتوں' گھونسوں اور مکوں کی بارش کرنے لگے۔ یہ سب اتنا اچانک تھا کہ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میرے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کی گئی' کبھی اوندھے منہ لٹا دیا جاتا' کبھی کھڑا کر کے دھکا دے دیا جاتا' میرے کپڑے چاقوؤں کی مدد سے پھاڑ دیے گئے۔ اس دوران میری آنکھوں پر بندھی پٹی اتر گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک طرف پاکستانی فوجی قطار بنائے کھڑے تھے جبکہ ساتھ ہی آفیسرز کی گاڑیاں تھیں جن میں ایک پر جھنڈا لگا ہوا تھا۔ امریکیوں نے مجھے مارا پیٹا اور بے لباس کر دیا مگر اسلام کے یہ محافظ ''میرے سابقہ دوست'' تماشا دیکھتے رہے' ان کے لبوں پر لگے تالے میرے لئے ناقابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے میری حوالگی کے سارے تقاضے پورے کر رکھے تھے۔ یہ وہ لمحات تھے جن کو میں قبر میں بھی نہ بھول سکوں گا۔ میں کوئی قاتل' چور' ڈاکو یا قانون کا مجرم نہیں تھا' مجھے بغیر کسی جرم کے امریکا کے حوالے کیا

جارہا تھا۔ وہاں موجود آفیسرز کم از کم اتنا تو کہہ سکتے تھے کہ یہ ہمارے مہمان ہیں' ہماری موجودگی میں ان کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جائے۔ وحشی' متعصب اور بے رحم امریکی فوجیوں نے ایسی حالت میں مجھے زمین پر پٹخ دیا کہ میرا جسم ننگا تھا۔ پھر مجھے ہیلی کاپٹر میں دھکیلا جہاں میرے ہاتھ پاؤں زنجیروں سے کس کے باندھ دیئے گئے اور آنکھوں پر پٹی بھی دوبارہ باندھی گئی۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا' میرے چہرے کو سیاہ تھیلے سے بھی ڈھانپ دیا۔ پھر میرے اردگرد سر سے پاؤں تک رسی باندھی اور ہیلی کاپٹر کے وسط میں زنجیر سے باندھ دیا۔ ہیلی کاپٹر فضاء میں بلند ہو گیا۔ میں جب حرکت کی کوشش کرتا تو زوردار لات پڑتی' مجھے لگا کہ آنے والے چند لمحوں میں میری روح اور جسم کا رشتہ ختم ہونے والا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کتنی دیر تک اس کرب میں مبتلا رہا۔ آخر کار ہیلی کاپٹر ایک جگہ اترا۔ وحشی امریکی درندوں نے ہیلی کاپٹر سے گھسیٹتے ہوئے مجھے نیچے پھینک دیا جس کے ساتھ ہی وہاں پہلے سے موجود دوسرے امریکی بھی مجھ پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگے اور میرا وہ حال کیا جو بیان سے باہر ہے۔ الٹا لٹا کر میرے اوپر چار پانچ افراد بیٹھ گئے اور ایسی باتیں کرنے لگے جیسے کسی اجلاس میں بیٹھے ہوں۔ میری سانس نہیں نکل رہی تھی' بے اختیار دل ہی دل میں حضرت عزرائیل کو پکار رہا تھا کہ اے عزرائیل کہاں ہو؟

مجھے اس جگہ دو گھنٹے اسی کرب میں رکھا گیا پھر دوسرے ہیلی کاپٹر میں سوار کرا کر ایک آہنی کرسی سے باندھ دیا گیا۔ اب کی بار مجھے مار نہیں پڑ رہی تھی۔ 25/20 منٹ بعد ہیلی کاپٹر نیچے اترا۔ مجھے اندر ہی کھڑا کیا گیا۔ یہاں متعدد جہازوں کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ مجھے نیچے اتار کر چہرے سے نقاب ہٹا دیا گیا اور آنکھوں کی پٹی بھی اتار دی گئی' دیکھا کہ چند امریکی فوجی کھڑے ہیں۔ بائیں جانب ایک قید خانہ نظر آیا جس میں چند قیدیوں کو باندھا گیا تھا۔ اسی جگہ مجھے بھی ڈال دیا گیا' یہاں موجود ایک چھوٹے سے واش روم میں مجھے منہ ہاتھ دھونے کو کہا گیا مگر میرے ہاتھوں میں سکت نہیں تھی۔ میں نے اتنا کیا کہ خود کو گیلا کر دیا' پھر مجھے ایک چادر دے کر ایسے کمرے میں لے جایا گیا جو دو میٹر لمبا اور ایک میٹر اونچا تھا۔ رفع حاجت کی جگہ بھی اتنی سی جگہ میں تھی۔ کمرے کی دیواریں آہنی تھیں اوپر سے مضبوط آہنی جالیاں بھی لگائی گئی تھیں۔ مجھے سونے کا کہا گیا مگر نہ بستر تھا نہ تکیہ۔ حیران تھا کہ میں کہاں لایا گیا ہوں اور مزید کس سلوک کا سامنا کرنا پڑے گا؟

میری بائیں جانب ایک بڑا کمرہ تھا جس میں بھی مجاہدین کو رکھا گیا تھا۔ ان کو بھی میری گرفتاری کا پتہ چل گیا۔ ہم ایک دوسرے کو صرف دیکھ سکتے تھے' باتیں کرنے کی اجازت نہ تھی۔ دیکھنے کا موقع بھی تب ملتا تھا جب کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ چند دن یہاں رہنے کے بعد پتہ چلا کہ ملا فاضل محمد' نور اللہ نوری' برہان رفیق اور غلام روغانی بھی یہاں ہیں' یہ طالبان مجاہدوں کے رہنماؤں میں سے تھے۔ ہمارے مابین بات چیت نہ ہوتی تھی۔ ایک دن مجھے ہتھکڑی پہنا کر ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جہاں تفتیش کا پہلا مرحلہ شروع ہونا تھا۔ میری انگلیوں کے نشانات لئے گئے' فوٹو گرافی ہوئی اور بائیو گرافی لکھی گئی۔ اس کے علاوہ کوئی سوال جواب کئے بغیر واپس اسی قید خانے میں لایا گیا جہاں رات کا کھانا پلاسٹک کے برتنوں میں پڑا ملا۔ ہلکا پھلکا کھانے کے بعد برتن فوجیوں کو واپس کر دیئے جس کے بعد سونے کا ارادہ باندھا۔ ابھی آنکھیں بند ہی ہو رہی تھیں کہ فوجیوں کے شور سے جاگ گیا۔ مجھے پکڑ کر دوبارہ تفتیش والے کمرے میں لے جایا گیا' جہاں پہلی دفعہ مجھ سے اسامہ بن لادن اور ملا عمر کے بارے میں سوالات پوچھے گئے اور نائن الیون کے بارے میں پوچھا گیا۔ میرے سارے جوابات نفی میں تھے جس سے شاید ان کو پتہ چل گیا کہ میرے پاس مطلوبہ معلومات نہیں ہیں۔ یہ وہ سوالات تھے جن کا جواب حاصل کرنے کیلئے ہزاروں بے گناہ افغان شہریوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ دہشت گردی وہ "مکا" ہے جسے امریکا کسی بھی وقت کسی کے بھی منہ پر مار سکتا ہے۔ اسی دہشت گردی کے نام پر افغانستان اور عراق پر قبضہ جمایا گیا۔

سوال جواب کا یہ سلسلہ پانچ دن تک مسلسل جاری رہا۔ میرے لئے اچھی بات یہ تھی کہ مار پیٹ نہ تھی۔ پھر ہمیں باگرام لے جانے کیلئے یونیفارم دیا گیا۔ میرے اور دوسرے ساتھیوں کے یونیفارم میں فرق تھا۔ مجھے خاکی' ان کو آسمانی رنگ کا یونیفارم دیا گیا۔ ہمارے ہاتھ اور پاؤں پلاسٹک کی رسیوں سے باندھے گئے' سر کو سفید پلاسٹک کے لفافے میں ڈھانپ کر گلے کے نزدیک لفافے کا منہ باندھ دیا گیا جس سے دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہم سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا۔ ہمارے ساتھیوں میں ایک عرب اور ایک امریکی مسلمان بھی تھا۔ میں نواں قیدی تھا۔ میں نے پانی مانگا مگر نہیں دیا گیا' تھیلا بھی نہیں ہٹایا گیا' صرف ہیلی کاپٹرز کی آوازیں اور امریکیوں کا شور سنائی دے رہا تھا جو بار بار Dont Move Shut UP کہتے رہے۔ یہ سلسلہ تین گھنٹے جاری رہا پھر ہیلی کاپٹر میں چڑھا کر دوسری جگہ منتقل کیا گیا۔ تقریباً 25 منٹ بعد ہیلی کاپٹر اترا اور ہمیں نیچے پھینکا گیا۔ یہاں بھی نئے فوجیوں نے ہم پر یلغار کر دی' کبھی لاتوں سے مارتے تھے' کبھی ہمارے جسموں پر چھلانگیں لگاتے تھے۔ ہمارے ہاتھ پیچھے باندھے گئے تھے۔ ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں بوٹوں سے مسلتے تھے۔ ایک امریکی جنرل نے میری شکل دیکھنا چاہی' میرے چہرے پر سے تھیلا ہٹایا گیا' جنرل نے دیکھا اور کوئی بات کئے بغیر دوبارہ ڈھانپنے کا اشارہ کیا۔ یہاں تین گھنٹے انتظار کرایا گیا۔ پانی دیا گیا نہ نماز پڑھنے دی گئی۔ ہم سب نے اشاروں سے نماز پڑھی۔ اس دوران ضربیں دی جاتی رہیں۔ رات کو ایک جہاز آیا جس میں ہم نو افراد کو چڑھایا گیا۔ جہاز کا یہ سفر اب بھی یاد آئے تو کانپنے لگتا ہوں' یوں سمجھ لیجئے کہ پل صراط تھا اور نزع کی حالت تھی۔ جہاز میں میرے پاؤں اور سینے کو کس کے باندھا گیا اور ایسی حالت میں سب ساتھیوں کو رکھا گیا کہ نہ بیٹھ سکتے تھے اور نہ لیٹ سکتے تھے۔ کمر کے درد سے ہماری چیخیں نکل رہی تھیں مگر سوائے صبر کے کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی کمر کو ٹیک لگاتے تو زوردار لاتیں پڑتی تھیں۔ ہم خود کوئی بات کر سکتے تھے اور نہ کوئی ترجمان تھا۔ یہ بہت تکلیف دہ لمحات تھے۔ راستے میں دو مرتبہ جہاز اترا پھر اڑا' بہت دیر بعد جہاز اترا' یہ باگرام ایئر پورٹ تھا۔

فوجیوں نے میری رسیاں کھولیں اور رن وے پر انتہائی بیدردی سے پھینکا' فوجی This is The Big One کہہ کہہ کر مجھ پر حملہ آور ہو جاتے اور لاتوں' گھونسوں اور مکوں کی بارش کر دیتے۔ اس سے بھی ان کا غصہ کم نہیں ہوا' پھر مجھے بندوقوں کے بٹ مارے گئے۔ میرا جسم ننگا ہو گیا تھا مگر چہرے پر وہی تھیلا' ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ اسی حالت میں مجھے برف پر پھینکا گیا۔ باگرام میں اس دن تازہ برفباری ہوئی تھی' مجھ پر تشدد کے دوران وہاں موجود امریکی عورتوں اور مرد فوجیوں نے گانا شروع کر دیا۔ ان کے جو شعر مجھے سمجھ آ رہے تھے' وہ یہ تھے:

"امریکا عدل و انصاف کا گھر ہے
عدل و انصاف کا طرفدار ہے
اور ہر کسی کیلئے انصاف چاہتا ہے"

ہمارے ساتھ ہونے والا وحشیانہ سلوک امریکیوں کو انصاف لگ رہا تھا۔ سخت سردی سے میرا جسم کانپ رہا تھا' بار بار کہا جاتا "Stop Movement" مگر کپکپی روکنا میرے بس میں کہاں تھا! اس ظلم اور ناروا سلوک کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گیا۔ بعد میں کسی چیز کا پتہ نہیں چلا۔ ہوش میں آیا تو بڑے کمرے میں پڑا تھا۔ نو دس بجے دن کا وقت تھا' سارے بدن میں درد تھا' جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا' چھ فوجیوں نے میرے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا جن میں دو نے چہرے چھپا رکھے تھے اور ہاتھوں میں ڈنڈے اٹھائے ہوئے تھے۔ دو دوسرے کالے رنگ کے فوجیوں نے میرے سر پر پستول تان رکھے تھے جبکہ سامنے دو اور فوجیوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ ہر فوجی نے چیخ کر باری باری پوچھا' بتاؤ اسامہ کہاں ہے؟ ملا عمر کہاں چھپا ہوا ہے؟ تم نے نیویارک اور واشنگٹن میں کیا کیا؟ میں چھ بندوں میں ننگا پڑا تھا۔ کیا انصاف ہے امریکا کا؟

درد اور تکلیف سے میری آواز نہیں نکل رہی تھی' دانتوں اور زبان میں درد تھا۔ یہ ایسا لمحہ تھا کہ میں مرنا چاہتا تھا مگر میری یہ خواہش بھی پوری نہ ہو رہی تھی۔ جب ان کو پتہ چلا کہ میں بات نہیں کر سکتا اور ان کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتا تو انہوں نے کچھ دیر کیلئے مجھے چھوڑ دیا۔ مجھے ایک سبز چادر میں لپیٹا اور ایک ٹھنڈے کمرے میں ڈال دیا۔ میری حالت انتہائی خراب تھی' صرف ایک چادر کے علاوہ میرے جسم پر کچھ بھی نہ تھا۔ درد کے مارے میں پھر بے ہوش ہو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو ایک رضائی میرے اوپر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر وہ بندھے ہوئے تھے۔ بہت کوشش کے بعد اپنے سر کو رضائی سے باہر نکالنے میں کامیابی ملی تو ایک امریکی خاتون فوجی کو دیکھا جو کمرے کے دروازے میں بیٹھی ہوئی تھی' وہ قریب آئی اور نرم لہجے میں پوچھا: کیسے ہیں آپ؟ میں نے پہلی دفعہ کسی امریکی کو انسانیت کا مظاہرہ کرتے دیکھا تھا۔ میں جواب نہ دے سکتا تھا۔ خاتون نے پھر پوچھا: انگریزی آتی ہے؟ میں نے ہونٹوں کو حرکت دینا چاہی مگر ایسا کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ شاید خاتون سمجھ گئیں' واپس پلٹیں اور کرسی پر بیٹھ گئیں۔

میرا خیال تھا کہ یہ گوانتاناموبے کا جزیرہ ہوگا مگر کمرے کی دیواروں پر پشتو زبان میں طالبان کی تحریریں دیکھیں' جن کے ساتھ تاریخیں بھی لکھی ہوئی تھیں' تو یقین آ گیا کہ یہ گوانتاناموبے نہیں افغانستان کا ہی کوئی علاقہ ہے۔ میں دورانِ قید ایک بھی نماز نہ پڑھ سکا' کھانا نہ پینا' نیند بھی صرف وہ تھی جو بے ہوشی کی حالت میں ہوتی۔ سارا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور بدن سے درد کی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ وقت اسی فکر میں گزرتا کہ آگے کیا ہوگا؟ شام کو حالت تھوڑی سنبھلی اور زبان کو حرکت ملنے لگی اس دوران دوسرے فوجی آ گئے جن سے میں نے انتہائی نحیف آواز میں پوچھا Can You Help Me

انہوں نے پوچھا کس چیز کی ضرورت ہے؟ میں نے نماز پڑھنے کی اجازت چاہی جو انہوں نے دے دی۔ میں نے بندھے ہاتھوں سے تیمم کیا اور بیٹھ کر نماز پڑھنا شروع کی۔ اس دوران دو فوجی میرے قریب بیٹھ گئے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے نماز مکمل نہیں پڑھنے دیں گے مگر اللہ نے رحم کیا اور میں نے پوری نماز پڑھ لی۔

سلام پھیرنے کے بعد ایک فوجی نے' جو وردی میں تھا' ایرانی فارسی میں صحت دریافت کی' کھانے کے بارے میں دریافت کیا اور پوچھا سردی تو نہیں لگی؟ ہر سوال پر میرا جواب "الحمدللہ" ہوتا۔ شکایت کرتا اور نہ کچھ مانگتا تھا۔ میں شکایت کیوں کرتا' میرے حال سے سب واقف تھے اور اگر کوئی واقف نہ تھا تو اس کو میرے جسم اور چہرے پر لگا خون صاف نظر آتا تھا۔ انہوں نے اسامہ بن لادن اور ملا عمر کے بارے میں پوچھنا شروع کیا اور میری طرف سے ہر سوال کا جواب نفی میں پایا تو ان کا رویہ سخت ہو گیا۔ ان کے سخت رویے نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔ میرے یہاں چھ روز مکمل ہو گئے تھے۔ ان چھ دنوں میں میں نے کھانا نہیں کھایا کیونکہ جو خوراک وہ دیتے تھے اس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ حرام ہے یا حلال؟ ٹھیک چھ دن بعد مجھے ایک گلاس چائے کے ساتھ آدھی افغانی روٹی دی گئی جس کے بعد چائے کے ساتھ ایک روٹی روزانہ دی جانے لگی۔

پاکستان میں طالبان کے آخری سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کی روداد ابتلاء

فدا محمد عدیل

میں نے پورا ایک مہینہ اسی طرح گزارا۔ پہرے پر مامور فوجیوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ مجھے نیند کے لئے نہ چھوڑا جائے۔ میں بیس دن تک بے خوابی کا شکار رہا، نہ کھانا وقت پر ملتا اور نہ ہاتھ پاؤں کھلے۔ روزانہ وہی دو افراد آتے اور ایک ہی قسم کے سوالات پوچھتے رہتے۔ میں کمرے میں اکیلا ہوتا تھا، کوئی نظر آتا تھا اور نہ کسی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ بیس دن بعد مجھے ایک چھوٹے سائز کا قرآن مجید کا نسخہ دیا گیا جس کی وجہ سے میری مصروفیت پیدا ہوگئی۔ شاید 24 یا 25 جنوری 2002ء کا دن تھا، صبح نو بجے کے قریب اچانک میرے کمرے میں ایک دوسرے قیدی کو لایا گیا جس کے کچھ وقفے کے بعد چھ مزید قیدیوں کو لایا گیا۔ ان سب کو مضبوط رسیوں سے باندھا گیا تھا اور سب کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئی تھیں۔ ان کے ساتھ عربی بولنے والے تفتیش کار بھی تھے جنہوں نے ان قیدیوں کو آپس میں بات نہ کرنے کا حکم دیا۔ فوجیوں نے دروازے کے سامنے بڑا تختہ رکھا اور دو مسلح فوجیوں کو کمرے کے اندر ہی پہرہ دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی مگر قیدیوں نے تھوڑی دیر بعد باتیں شروع کر دیں۔ میں خاموش رہا۔ ایک عربی تفتیش کار نے آ کر ان کو چپ کرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک عرب بھائی نے مجھ سے پوچھا، آپ ضعیف ہیں؟ میں نے کہا ہاں وہی ہوں۔ پھر دوسرے بھائیوں نے بھی اپنا تعارف کرایا۔ ان میں سالم قطر، سلمان یمن، شیخ فیض کویت، سمیرا الجزائر، طارق الجزائر (جس کے پاس برطانیہ کی شہریت بھی تھی) اور محمد قاسم حلیمی کا تعلق افغانستان سے تھا۔ ان سب کو عصر تک میرے ساتھ رکھا گیا۔ شام کو یہ سارے افراد واپس لے جائے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے ان قیدیوں کے ساتھ جو لمحات گزارے، ان سے مجھے بہت خوشی محسوس ہوئی۔ رات گزری، صبح ان کو دوبارہ لایا گیا، میں نے ان کو خوش آمدید کہا اور خیریت دریافت کی۔ انہوں نے رات دیگر قیدیوں کے ساتھ گزاری تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس ریڈ کراس کے لوگ آئے تھے مگر امریکی نہیں چاہتے کہ ریڈ کراس والے ہم سے ملیں۔ ہم نے عصر تک خوب گپ شپ کی۔ ان دو دنوں کے دوران نسبتاً اچھا کھانا دیا گیا۔ دوسری شام ان کو پھر لے جایا گیا۔ میرے کمرے میں بلا کی سردی تھی۔ دو دن بعد مجھے نچلی منزل لے جایا گیا جہاں محمد قاسم حلیمی اور سالم موجود تھے۔ یہاں ہم نے پھر گپ شپ شروع کی۔ ہم تین دن ساتھ رہے۔ آخری رات ان کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ رات کو حلیمی صاحب کو بھی تفتیش کے لئے لے جایا گیا۔ میں عشاء کی نماز سے فارغ ہی ہوا تھا کہ فوجی آئے اور کہا آپ کو نیچے لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے نیچے دوسرے مسلمان بھائیوں کو بھی دیکھا جن کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ یہ بیس کے لگ بھگ افراد تھے جن کے چہروں پر کالے سیاہ تھیلے چڑھائے گئے تھے جو منتقل ہونے کی نشانی تھی۔ ہمیں پتہ نہ تھا کہ کہاں منتقل کیا جا رہا ہے۔ ہم سب کے ہاتھ پیچھے باندھے گئے اور قطار میں کھڑا کر کے سب کو ایک رسی سے باندھ دیا گیا۔ اس رسی کو امریکی فوجی کبھی ایک جانب کھینچتے کبھی دوسری جانب، جس سے سارے قیدی ایک طرف گر جاتے، ان کو اٹھایا جاتا اور پھر یہی عمل دوہرایا جاتا۔ نافع نامی ایک سوڈانی عرب کی دونوں ٹانگیں زخمی تھیں۔ وہ درد کے مارے چیختا تو فوجی اس کو چپ کرانے کے لئے مارنا شروع کر دیتے تھے۔ امین اللہ نامی ہمارا ایک ساتھی چیخ چیخ کر کہتا کہ ہمیں ذبح کرنے کے لئے لے جایا جا رہا ہے۔ ہم سب کا اندازہ یہی تھا کہ ہمیں مار دیا جائے گا۔ کوئی با آواز بلند کلمہ شہادت کا ورد کر رہا تھا، کسی نے قرآن مجید کی آیات کی تلاوت شروع کر دی تھی۔ اسی کشمکش میں ایک طرف روانہ کر دیا گیا۔ یہ ویران اور بنجر زمینیں تھیں۔ ہم گرتے پھر اٹھ جاتے۔ ہم نے ایک بڑے جہاز کی آواز سنی۔ ہمیں رفتہ رفتہ اس جہاز کے قریب لے جایا گیا، جہاز کے نزدیک لے جا کر ہمیں دھکے دیئے گئے اور ایک دوسرے کے اوپر گرا دیا گیا پھر ایک ایک کر کے جہاز میں چڑھایا گیا' جہاں گردن اور پاؤں کو رسیوں سے باندھ کر ہمیں جہاز میں ایک بنچ سے باندھ دیا گیا۔ ہم میں سے کوئی فریاد کرتا تو اسے مضبوط لات پڑتی۔ یہ غالباً 8 یا 9 فروری 2002ء کا دن تھا۔ ایک گھنٹہ بعد جہاز اترا اور تمام قیدیوں کو باری باری اتارا گیا۔ مجھے کھینچتے ہوئے جہاز سے دور لے جایا گیا اور گھونسوں، لاتوں، ٹھوکروں کی بارش کر دی گئی۔ پھر ہم سب کو اکٹھا کیا گیا۔ کبھی ایک ایک کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا، کبھی ایک ایک فوجی کئی کئی قیدیوں کو مارتا۔ سخت سردی میں مٹی میں بٹھا کر اوپر پانی ڈالا جاتا اور وحشی فوجی دانتوں سے کاٹنے لگتے۔ اس سلوک سے بھی وہ مطمئن نہ ہوتے تو لاٹھیوں سے حملہ آور ہو جاتے۔ ہمارے لئے قدرے اطمینان کی بات یہ تھی کہ چونکہ چہرے پر تھیلے چڑھے ہوئے تھے اس لئے ہمارے چہرے مٹی سے بچے ہوئے تھے۔ اس دوران دو فوجیوں نے بازوؤں سے پکڑ کر مجھے مٹی سے باہر نکالا اور اپنے بھاری بوٹوں سے میری پسلیوں میں ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ مجھے اٹھا کر زمین پر الٹا پٹخ دیا جاتا۔ زمین پر گرنے کے ساتھ ہی چار پانچ فوجی میرے سر، کمر اور ٹانگوں پر چھلانگیں لگانا شروع کر دیتے۔ اس ظلم کے دوران میں سوچتا کہ کہاں گئے وہ انسانی حقوق کے علم بردار؟ میرا ننگا بدن اور اتنا ظلم! مگر میں اللہ سے حوصلہ مانگتا تھا۔ پھر کیمروں کی ٹک ٹک شروع ہوگئی۔ قیدیوں کی تصاویر بنانے کا عمل شروع ہوا۔ فلیش کی لائٹس سے آنکھیں چندھیانے لگیں۔ اس بدترین تشدد کے دوران میرے سر کا تھیلا اترا ہوا تھا۔ میں نے زندگی کا ہولناک منظر دیکھا جب سارے قیدی ننگے تھے، کوئی مٹی میں پڑا تھا، کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ میرا دل پھٹا جاتا تھا۔ امریکی مرد و عورتوں کے لئے یہ دل لبھانے والا تماشا تھا، وہ ہنس ہنس کر ہم بے بس انسانوں کی تصویریں بنا رہے تھے۔ اس انسانیت سوز مظاہرے کے بعد ہمیں ایک بڑے خیمے کے اندر لے جایا گیا جہاں سوال جواب، فوٹو گرافی اور ڈاکٹر کے ذریعے طبی معائنے کے بعد ہمیں یونیفارم دیا گیا۔ خیمے کی چار دیواری لکڑی کے تختوں سے بنائی گئی تھی جو زمین سے صرف ایک میٹر اونچی تھی۔ خیمہ مستطیل شکل کا تھا اور چاروں طرف خاردار تاریں بھی لگائی گئی تھیں۔ اس قسم کے خیمے چاروں اطراف میں نظر آتے تھے، ایک ایک خیمے میں بیس بیس افراد سما سکتے تھے۔ مجھے ایک فوجی نے وہ سامان دکھایا جو غالباً ہر قیدی کو دیا گیا تھا۔ ایک اوڑھنے کی چادر، ایک جوڑا جراب، بوٹ اور کپڑے کی ایک ٹوپی مجھے بھی دی گئی۔ مجھے نارنجی شلوار قمیض بھی دی گئی جو میں نے پہن لی۔ ملا محمد صادق بھی اسی خیمے لائے گئے جن کا تعلق صوبہ ارزگان سے تھا۔ ان کو چمن سے گرفتار کر کے لایا گیا تھا، وہ افغان جہاد کے دنوں میں صدقہ تنظیم کے پلیٹ فارم سے ہمارے امیر رہے تھے۔ سخت سردی تھی' میں نے ان کو لباس پہننے میں مدد دی۔ آس پاس کے خیموں میں قیدی ایسے لگتے تھے جیسے سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر گئے ہوں۔ ملا اخوند مجھ سے بار بار پوچھتے کہ کتنے لاشے پڑے ہوئے ہیں؟ میں کہتا کہ یہ مرے نہیں، سو رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہر خیمے سے اذان کی آوازیں آنے لگیں، جیسے ہم کسی شہر میں ہوں۔ ملا اخوند نے الحمدللہ کہا، سجدے میں گر گئے اور کہا ''ضعیف بھائی مجھے تو لگتا ہے کہ ہم اسلام کے قلعے میں آ گئے ہیں۔''

اذانوں کی یہ آوازیں اتنی مسحور کن تھیں کہ سردی، درد، بھوک اور پیاس سمیت ساری تکلیفیں بھول گئے۔ میں سوچتا تھا کہ یہ مار پیٹ، بدن کا ننگا ہونا، ہفتہ ہفتہ بھر بھوکا پیاسا رہنا، نجانے خدا کیوں ناراض ہے اور ہم نے مزید کن امتحانوں سے گزرنا ہے۔

قندھار میں تفتیش کا مرحلہ

صبح ہوئی ہم نے نماز پڑھی، اس کے بعد آرام کرنا چاہا مگر اجازت نہ دی گئی۔ مجھے چھوڑ کر عرب بھائیوں کو تفتیش کے لئے لے جایا گیا۔ لے جاتے وقت بہت مشکل لمحہ ہوتا، فوجی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لے کر آتے اور چیخ چیخ کر کہتے کہ نکلو، پھر ہاتھ پیچھے باندھ کر بندوقیں تان لیتے اور دو زانو کھڑا کر کے پھرنے پر مجبور کرتے۔ قیدیوں کو مٹی کے گارے میں پھینکتے پھر اٹھاتے اس کے بعد سر اور چہرے پر تھیلا چڑھا کر باہر نکالتے اور خیمے کا دروازہ بند کر دیتے۔ آرام ہمیں نہ دن کو تھا، نہ رات کو۔ تفتیش کے مراحل دونوں اوقات میں ہوتے۔ تفتیش کے لئے لے جاتے وقت قیدیوں کے سر زمین سے رگڑے جاتے' ان کو گھٹنوں کے بل چلنے کو کہا جاتا، پیچھے کتے لگا دیئے جاتے تاکہ قیدی تیز تیز چلیں۔ اس دوران ایک بے حیا نیم برہنہ امریکی عورت اپنی تیز اور کانوں میں سیسہ گھولتی آواز سے تیز چلنے کو کہتی۔ میں جب گھٹنوں کے بل جاتا تو میرے گھٹنوں کا گوشت ادھڑ جاتا اور شلوار پھٹ جاتی تھی۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا جاتا، اس دوران آنکھیں بندھی ہوتیں، میں اور میرے دوسرے ساتھی بے رحم امریکی فوجیوں کے رحم و کرم پر ہوتے۔ اگلی صبح ریڈ کراس کے کچھ لوگ آئے جو ہماری حالتِ زار سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں کاغذ دیئے کہ اپنے گھروں کو خط لکھیں۔ ریڈ کراس کے اہلکار خاردار تار کے اس پار کھڑے ہو کر ہماری طبیعت پوچھتے۔ ہمارا شک تھا کہ یہ کسی امریکی خفیہ ادارے کے لوگ ہوں گے۔ اس لئے ہم احتیاط سے بات کیا کرتے اور ان کو دل کا حال نہ بتا سکتے تھے۔ ریڈ کراس کا خطوط کے بتادلے میں جو کردار تھا وہ قابل ستائش ہے۔ ریڈ کراس والے روٹی، چائے اور کتابوں کی دستیابی کے حوالے سے پوچھتے۔ ہم کہتے کہ مناسب مقدار اور تعداد میں یہ چیزیں نہیں مل رہیں۔ احترام انسانیت، مذہبی کتابوں کے تقدس کا خیال رکھنے اور مناسب مقدار میں پانی دینے کے ہمارے مطالبات کبھی بھی پورے نہیں ہوئے۔

10 فروری 2002ء سے جولائی کے آغاز تک مجھے قندھار میں رکھا گیا۔ اس دوران چہرہ دھو سکا نہ ہاتھ۔ صرف پینے کے لئے تھوڑا سا پانی ملتا تھا۔ چوری چھپے منہ ہاتھ دھونے پر سخت سزا دی جاتی اور اسی خوف سے کوئی ہاتھ پیر اور منہ دھونے کی کوشش نہ کرتا۔ ایک مرتبہ سات سات افراد کو باندھ کر خیمے سے چند قدم دور لے جایا گیا جہاں باری باری سب کے کپڑے اتارے گئے۔ ہر قیدی اپنے مخصوص اعضاء تک چھپانے سے قاصر تھا۔ سب کو ایک ایک لوٹا پانی دے کر خود کو دھونے کا حکم سنایا گیا۔ امریکی مرد و عورتیں ارد گرد کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے۔ یہ بہت توہین آمیز بات تھی کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے خود کو دھوئیں۔ میں ساتھیوں کو آواز دیتا کہ ہم مجبور ہیں، آنکھیں بند کر کے نہائیں۔ یہ میرے لئے انتہائی افسوس ناک بات تھی کہ قندھار کی سرزمین پر ہمیں منہ ہاتھ دھونے کی اجازت دی گئی اور نہ غسل کرنے کی۔

اگلے دن مجھے تفتیش کے لئے لے جایا گیا۔ قندھار میں مجھ سے تفتیش کا یہ دوسرا مرحلہ تھا۔ ایک ٹینٹ میں لے جا کر ہاتھ باندھے گئے اور بائیوگرافی لکھی گئی، اس کے بعد نسبتاً نرم لہجے میں سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ سوال پوچھنے والوں کی ملا عمر اور اسامہ بن لادن سے دلچسپی زیادہ تھی۔ میرے جوابات اکثر نفی میں ہوتے۔ تین مختلف قسم کے کاغذات سرخ، زرد اور سفید پر لکھے جاتے۔ دو گھنٹے پر محیط اس تفتیش کے بعد تھیلا سر اور چہرے پر چڑھا کر مجھے واپس لایا گیا۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ مجھے لے جایا جاتا اور واپس لایا جاتا۔ سوالات بھی روزانہ ایک ہی قسم کے ہوتے اور میرے جوابات بھی۔ قندھار میں دورانِ قید شرائط زیادہ سخت نہ تھیں، ہر خیمہ میں بیس قیدیوں کو رکھا جاتا جن میں تین افراد کو اکٹھا بیٹھنے کی اجازت تھی، تین سے زیادہ بیٹھتے اور باتیں کرتے تو سخت سزا دی جاتی تھی۔ ہم نماز باجماعت پڑھ سکتے تھے، سردی کا موسم تھا' دھوپ میں بھی بیٹھنے کی اجازت تھی مگر جس چیز کا نام انسانی عفت ہے وہ یہاں عنقا تھی۔

رات کو سونے کے دوران کتوں کے بھونکنے سے سارے قیدی جاگ جاتے۔ اس وقت تک قیدیوں کی تعداد چھ سات سو تک پہنچ چکی تھی۔ فوجی اپنے کتوں کے ہمراہ آتے، ایک ایک قیدی کو الٹا الٹا کر اس کی تلاشی لیتے، کتے قیدیوں کے بدن سونگھتے۔ یہ سلسلہ ساری رات چلتا رہتا۔ قیدیوں کو زائد المیعاد ڈبہ بند خوراک دی جاتی تھی جس میں کبھی کبھار خنزیر کا گوشت بھی ہوتا تھا، جو بہت سے بھائی لاعلمی میں کھا لیا کرتے تھے۔ وہ ڈبوں کا لکھا نہیں جانتے تھے بالخصوص انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھے۔ اکثر اوقات خوراک سے بدبو آتی مگر یہ جاننے کے باوجود کہ یہ خوراک صحت کے لئے نقصان دہ ہے، ہم مجبوری کے تحت کھا لیتے تھے کیونکہ ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ جون میں ہماری خوراک میں تبدیلی لائی گئی۔ اب کی بار خوراک کی کیفیت بھی اچھی تھی اور ساتھ کچھ میوہ اور میٹھا بھی دیا جانے لگا۔ خوراک کے ڈبوں پر "حلال" اور "Kosher" لکھا ہوتا۔ خوراک کے ساتھ ایک افغانی روٹی بھی دی جانے لگی۔ روٹی کی تقسیم کا طریقہ کار یہ تھا کہ خیمے کے سامنے ڈبوں کا کارٹن رکھا جاتا۔ ایک ایک بوتل پانی بھی دیا جاتا۔ آدھے گھنٹے میں کھانا کھا کر ڈبے واپس کرنے کی پابندی تھی۔ کوئی یہ پابندی توڑتا تو اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ تیونس کے عادل اور الجزائر کے سمیر بڑے "اداکار" تھے۔ کسی طریقے سے دو دو ڈبے ہتھیا کر چھپ چھپ کر کھاتے۔ بیس افراد کے لئے ٹائلٹ پیپر کا ایک رول روزانہ دیا جاتا، ایک باریک کپڑے کی چادر لگا کر بیت الخلا بنایا گیا تھا، رفع حاجت کے وقت ہم فوجیوں کو اور فوجی ہمیں نظر آتے۔ دن میں تین مرتبہ طبی عملہ آتا جس میں اکثریت عورتوں کی تھی اور وہ مکمل ڈاکٹر معلوم نہ ہوتے تھے۔ ہر مرض کی دوا پانی کو قرار دیتے تھے۔ قبض، بخار اور زکام عام بیماریاں تھیں۔ قیدیوں کے خیمے ایئرپورٹ کے نزدیک ایسی جگہ لگائے گئے تھے جہاں ہر وقت طیاروں کا شور ہوتا اور گرد و غبار کے مرغولے اٹھتے۔ کپڑے اور خوراک ہر وقت مٹی سے اٹی رہتی تھی۔ طیاروں کے گزرنے کی وجہ سے خیمے اوپر اٹھ جاتے۔ قیدی اس وجہ سے رات کو نیند پوری نہ لے سکتے تھے۔ امریکی فوجی قیدیوں کو تشدد کا نشانہ بناتے وقت ایسی غلیظ گالیاں دیتے جو انگریزی نہ جاننے کے باوجود سب کو سمجھ آتی تھیں۔ فوجی جس قیدی کو سویا ہوا پاتے تو اس کے سر پر چھوٹی کنکری یا ڈھیلا مارتے اور اس کی نیند خراب کر دیتے۔ دن رات میں تین دفعہ قیدیوں کی گنتی کی جاتی اور سب کو قطار میں کھڑا کر کے باقاعدہ "حاضری" لی جاتی تھی۔ میرا نمبر 306 تھا۔ یہاں مجھے دو بہت دلچسپ قصے یاد آ گئے۔

گنتی کرنے والوں کی اپنی شرائط تھیں۔ ہر بار نیا فوجی گنتی کرنے آتا۔ ایک مرتبہ ایک فوجی آیا اور ترجمان کی مدد سے حکم سنایا کہ جب میں نظر آؤں تو تمام قیدی کھڑے ہو جائیں اور قطار بنا کر سر جھکائیں، جس قیدی کا نمبر پکاروں، وہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ جائے۔ حیرانی اس بات پر نہ تھی کہ ایک کم درجے کا فوجی یوں غرور کا مظاہرہ کر رہا تھا بلکہ افسوس اس بات کا تھا کہ اس امریکی کو جیسے ملک میں کوئی دوسرا دھندہ ہاتھ نہ آیا تو فوج میں بھرتی ہو گیا اور یہاں آ کر مسلمانوں سے اپنی نفرت کا یوں متکبرانہ انداز میں اظہار کر رہا تھا۔ ایک کالا کلوٹا بندر کی شکل کا فوجی جو انتہائی سخت گیر تھا، گنتی سے پہلے تمام قیدیوں کو قطار میں کھڑا کرتا اور گنتی کا عمل دو دو تین تین گھنٹے تک جاری رکھتا۔ یہ یہاں زندگی گزارنے کے لئے آیا تھا۔ شیر سے لے کر ٹڈی دل تک کے حقوق کا اس کا ملک پر چارک تھا، مگر ہم مسلمانوں کے لئے جائے پناہ نہیں تھی۔ ایک دن ہمارے خیمے کے خاردار تار چیک کر رہا تھا کہ اس کو زمین پر پڑا شیشے کا ایک ٹکڑا ملا، میرے پاس آ کر پوچھا: یہ شیشے کا ٹکڑا کون لایا ہے؟ میں نے لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ نہ سامان میرا اپنا ہے اور نہ خود آیا ہوں۔ اس نے اصرار کیا کہ مجھے بتاؤ۔ مگر چونکہ واقعی مجھے علم نہیں تھا اس لئے میرے جواب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ چیخ چیخ کر غلیظ گالیاں بکنے لگا۔ اس نے مجھے دوزانو کھڑا کیا اور صلیب کی طرح ہاتھ پھیلانے کا حکم سنایا۔ اسی طرح کئی گھنٹے گزر گئے۔ وہ مجھے دیکھتا تو گالیاں سناتا۔ میں پوچھتا کہ گالیاں کیوں دیتے ہو؟ تو مزید گالیاں دینا شروع کر دیتا۔ فوجیوں کو جواب دینا جرم تھا۔ ان کے لئے کوئی قانون نہ تھا، غلاموں کی یہ بادشاہی یاد آتی ہے تو دل بہت جلتا ہے۔ ہم دلیر جوان، جوان بزدل لوگوں کے چنگل میں تھے، کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ ہمارے پڑوس میں ایک دوسرا قید خانہ تھا، جہاں کے قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا تھا۔ ان کے جسم کپڑوں سے بے نیاز تھے اور ان پر کتے بھی چھوڑے جاتے تھے۔ ایک دن ہمارے قید خانے میں ایک سفید ریش بوڑھے کو لایا گیا جو اپنے حواس کھو چکا تھا، انتہائی سہما ہوا تھا، فوجیوں اور قیدیوں میں تمیز نہ کر سکتا تھا، کمزوری کی وجہ سے نہ اٹھ سکتا تھا نہ بول سکتا تھا۔ فوجیوں نے اس پر چڑھ کر اس کو باندھنا شروع کیا تو وہ زور زور سے چیخنے لگا کہ دو رکعت نفل تو پڑھنے دو پھر ذبح کر لو۔ ہم نے سمجھایا کہ بابا آپ کو ذبح کرنے نہیں، تفتیش کرنے لے جایا جا رہا ہے' مگر وہ ہماری نہ سنتا تھا۔ یہ پہلا قیدی تھا جس کو بعد میں گوانتاناموبے سے رہا کیا گیا۔ اس کی عمر 105 سال تھی اور تعلق صوبہ ارزگان سے تھا۔

ایک رات کھانا کھایا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد سونے ہی لگے تھے کہ اچانک بہت ساری تعداد میں فوجی اندر آئے۔ باہر ہیلی کاپٹر کی آوازیں بھی آ رہی تھیں، فوجیوں نے آتے ساتھ ہی ہلہ گلہ مچا دیا۔ ایک ایک قیدی کو باہر پھینکتے اور الٹا الٹا کر تلاشی لیتے۔ اس منظر کی ویڈیو فلم بھی بنائی گئی تاکہ وہ امریکیوں کو دکھا سکیں کہ ہم نے دہشت گردوں (ان کے بقول) کو کس طرح قابو میں رکھا ہوا ہے۔ ایک مرتبہ آدھی رات کو لگ بھگ ایک بجے کے قریب دو فوجیوں کے ذریعے مجھے بندھی آنکھوں اور بندھے ہاتھوں تفتیش والے کمرے لے جایا گیا جہاں میری خوب خاطر مدارت کی گئی، مجھے کرسی پر بٹھایا گیا، سامنے میز پر چائے اور کچھ مٹھائی پڑی تھی، بعد میں دو اور فوجی بھی آ گئے جن کا رویہ غیر متوقع طور پر شائستہ تھا۔ میں حیران تھا کہ آج یہ کیسے انسان کے بچے بن گئے ہیں۔ انہوں نے میرا ہاتھ کھولا اور پھر انتہائی نرم لہجے میں میری طبیعت پوچھی، گھر کے بارے میں پوچھا اور بتایا کہ ہمیں آپ کے خلاف کوئی شہادت نہیں ملی۔ انہوں نے پیسے کی لالچ دی اور اس شرط پر رہائی کی پیشکش کی کہ آپ ملا عمر اور اسامہ بن لادن کی گرفتاری میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ معلوم نہیں اس وقت مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی کہ میں نے انتہائی پُراعتماد لہجے میں کہا کہ مشروط رہائی سے میری گرفتاری بہتر ہے۔ میں نے اپنی گرفتاری کی وجہ پوچھی تو ایک فوجی نے بتایا کہ ہمیں شک تھا کہ آپ القاعدہ اور نائن الیون کے واقعے کے بارے میں جانتے ہوں گے مگر ہمیں اس حوالے سے آپ کے ذریعے کوئی معلومات نہیں ملیں (ان کی نظر میں میں ماڈریٹ تھا)، میں نے ان سے کہا کہ آپ کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے ان کی شرائط پر رہا ہونے سے صاف انکار کیا تو ان کا رویہ سخت ہو گیا اور نامراد واپس لوٹنا پڑا۔ وہ لگاتار تین دن تک آتے رہے اور مجھے اپنے فیصلے پر نظرثانی کا کہتے رہے مگر میرا جواب ایک ہی تھا۔

ایک دن مجھے تفتیش کے لئے لے جایا گیا تو ایک تفتیش کار نے پوچھا کہ آپ متوکل صاحب (طالبان دور کے وزیر خارجہ) کو جانتے ہیں؟ ان کا احترام کرتے ہیں؟ اور کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان سے آپ کی ملاقات ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ مجھے شک ہوا کہ وکیل احمد متوکل صاحب بھی پکڑے گئے ہیں۔ میں نے پوچھا متوکل صاحب کہاں ہیں اور ان سے کیسے ملاقات ہو سکتی ہے؟ تفتیش کار نے بتایا کہ وہ ہماری تحویل میں ہیں، آپ چاہیں تو لے آئیں؟ میں نے کہا ضرور۔ میں ان سے اس لئے بھی ملنا چاہتا تھا کہ معلومات لے سکوں اور ان سے طالبان بھائیوں کی حالتِ زار کے بارے میں پوچھ سکوں۔ مگر مجھے اس امر کا پتہ نہیں تھا کہ ہماری ملاقات سے امریکی فوج کا مقصد کیا تھا؟ کچھ دیر بعد متوکل صاحب کو لایا گیا۔ ان کے ہاتھ میں ایرانی بسکٹ بھی تھے جو وہ بطور تحفہ میرے لئے لائے تھے۔ علیک سلیک کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس لئے بسکٹ کھانا ممکن نہ تھا، میں نے ان کا تحفہ قبول کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا مگر یہ بسکٹ میں اپنے ساتھ بھی نہ لے جا سکتا تھا۔ دس منٹ گفتگو کے بعد متوکل صاحب رخصت ہوئے اور مجھے واپس لے جایا گیا۔ اس ملاقات سے مجھے اندازہ ہوا کہ بہت جلد گوانتاناموبے لے جایا جاؤں گا۔ گو کہ متوکل صاحب نے ایسی کوئی واضح بات نہیں کہی تھی مگر میرا گمان یہی تھا۔ اس کے دوسرے دن مجھے پھر تفتیش والے کمرے لے جایا گیا۔ یہ قندھار میں میری تفتیش کا آخری مرحلہ تھا۔ تفتیش کار نے مجھے بتایا کہ یکم جولائی کو گوانتاناموبے کے لئے آپ کی پرواز ہوگی۔ ہم ان قیدیوں کو گوانتاناموبے بھیجتے ہیں جو مرتے دم تک وہاں رہیں گے اور موت کے بعد بھی یہ گارنٹی نہیں کہ ان کی میت وطن واپس لائی جائے گی یا نہیں؟ اب یہ آپ کے پاس آخری موقع ہے بتائیں گھر جانا ہے یا گوانتاناموبے؟ گھر واپسی کے لئے اس تفتیش کار نے اپنی پرانی شرائط دوہرائیں۔ بالفاظِ دیگر مجھے کہا کہ آپ کو رہائی کے بدلے امریکی جاسوس بننا ہوگا۔ اللہ مجھے اس کام سے بچائے۔ تفتیش کار نے سوچنے کے لئے پھر ایک دن کی مہلت دی اور کہا کہ خوب سوچ سمجھ کر کل جواب دے دو۔ میں نے بغیر کسی تامل کے جواب دیا کہ کل بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے سوچ لیا ہے، میں کسی قسم کی مصلحت سے کام نہیں لوں گا کیونکہ میں خود کو قصوروار نہیں سمجھتا۔ آپ کی مرضی جہاں لے جانا چاہتے ہیں، لے جائیں۔ میرا جواب سننے کے بعد مجھے واپس خیمے لایا گیا۔ میں اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کب مجھے گوانتاناموبے روانہ کیا جائے گا۔ اس کے اگلے دن میری داڑھی، سر کے بال اور مونچھیں پھر مونڈ دی گئیں۔

یکم جولائی 2002ء کی شام بہت زیادہ تعداد میں امریکی فوجی آئے اور ہم میں سے آٹھ افراد کو قطار میں کھڑا کر کے سروں پر کالے تھیلے چڑھائے گئے، کانوں میں روئی ٹھونسی گئی اور ہاتھ باندھے گئے۔ ہم آٹھ افراد کو ایک دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا، جہاں ہمارے کپڑے اتارے گئے اور ہماری برہنہ فوٹو گرافی شروع ہوئی۔

(جاری ہے)

قندھار سے گوانتاناموبے تک سفر ہمارے لیے ایک نیا عذاب ثابت ہوا (تیسرا حصہ)

پاکستان میں طالبان کے آخری سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کی روداد ابتلاء

فدا محمد عدیل

اس کے بعد سرخ رنگ کے کپڑے اور سرخ بوٹ پہنائے گئے، ہاتھوں اور پاؤں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالی گئیں۔ ہتھکڑیاں ایسی سخت تھیں کہ ہم اپنے ہاتھوں کو حرکت تک نہ دے سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد ہمیں مار مار کر اور دھکے دے دے کر جہاز میں سوار کرایا گیا جہاں ہم سب کو ایک مشترکہ زنجیر سے باندھ کر اس کو تالا لگا دیا گیا۔ زنجیر کو اس قدر کس کے باندھا گیا تھا کہ کوئی بھی ساتھی حرکت نہ کر سکتا تھا، نہ آگے نہ پیچھے، نہ دائیں نہ بائیں۔ ایک نئے عذاب نے ہمیں گھیر لیا۔ جہاز نے اڑان بھری۔ ہر قیدی کے سامنے دو فوجی کھڑے ہو گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ قیدیوں کی فریاد بھی بڑھتی گئی۔ میرے ساتھ ہی بندھے خیر اللہ خیر خواہ (سابق گورنر ہرات) نے کئی بار ہاتھوں میں تکلیف کی شکایت کی مگر بے سود۔ میں بھی سخت اذیت سے دوچار تھا، کمر ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھی، پاؤں میں اتنا شدید درد تھا جیسے کاٹے گئے ہوں۔ شکایت اس لئے نہیں کر سکتا تھا کہ قصائی کو کون ڈاکٹر سمجھتا ہے؟ کچھ دیر بعد بہت سے ساتھیوں نے تکلیف کے مارے باقاعدہ رونا شروع کر دیا، جیسے ہر کوئی نزع کی حالت میں ہو۔ ہمیں پرواز سے چار گھنٹے قبل جہاز میں باندھا گیا تھا، تین گھنٹے جہاز اترنے کے بعد رکھا گیا جبکہ بیس گھنٹے کی مسافت تھی، اس طرح جہاز سے قید خانے تک ہم نے جو وقت لیا وہ کل ملا کر 30 گھنٹے بنتا ہے۔ ہم 30 گھنٹے زندگی کے سخت ترین عذاب سے گزرے۔ ہمیں توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کڑے وقت کی جزا اپنی رضا کی صورت میں ضرور عطا فرمائے گا۔ قندھار سے گوانتاناموبے تک ہر قیدی کو صرف ایک گلاس پانی اور ایک عدد سیب دیا گیا۔ شاباش انسانی حقوق کے علم برادرو! 30 گھنٹے اور ایک گلاس پانی اور ایک سیب؟ اس سے اندازہ لگائیے کہ انسانیت کا کتنا احترام ہے امریکی دلوں میں۔ میں نے سیب کو ہاتھ لگایا نہ پانی کو۔ اول تو ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، دوم اگر میں کچھ کھاتا پیتا تو پیشاب کی صورت میں ایک نئے عذاب سے گزرنا پڑتا۔ ہم سب کے ہاتھ پاؤں سوج گئے۔ دس بارہ گھنٹے بعد تو بالکل بے حس ہو گئے۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہاتھ پاؤں میں چبھ گئی تھیں جن کو اتارتے وقت امریکیوں کو بھی دقت ہوئی۔ دورانِ سفر جہاز کچھ وقفے کے لئے ایک جگہ اترا بھی تھا مگر ہمیں پتہ نہیں چلا کہ وہ کونسی جگہ تھی۔

ہمیں جہاز سے ایک ایک کر کے اتارا گیا۔ پھر ایک دوسرے کے پیچھے باندھ کر گاڑیوں میں ٹھونسا گیا۔ انگلش اور عربی زبانوں میں حرکت نہ کرنے کا حکم بار بار سنایا جاتا۔ کوئی حرکت کرتا تو زوردار لات اس کا مقدر بن جاتی۔ میں نے بھی متعدد لاتیں کھائیں۔ ہمارے ہاتھ پاؤں کی سوجن ایک مہینے تک برقرار رہی جبکہ تین مہینے تک ہاتھ پاؤں ایسے محسوس ہوتے تھے جیسے شل ہو چکے ہوں۔ ہم سب کو گاڑیوں سے اتارا گیا اور سیدھا ایک کلینک لے جایا گیا جہاں سارے قیدیوں کے ایکسرے کرائے گئے۔ پھر ایک تفتیشی کمرے لے جایا گیا۔ میری باری آئی تو پہلے مجھے اس کمرے میں باندھا گیا، کچھ دیر بعد ایک شخص آیا جو فارسی بولتا تھا' اس نے پوچھا کیسے ہو؟ میرا نام نام ہے، مجھے یہاں تفتیش پر مامور کیا گیا ہے۔ میں سخت تھکا ہوا تھا بات نہ کر سکتا تھا۔ صرف اتنا کہا کہ میں بات کرنے کی طاقت نہیں رکھتا پھر دیکھیں گے۔ مگر اس کا بات کرنے کا اصرار بڑھتا رہا۔ میں نے سوچا کہ پہلے میں گوانتاناموبے بھیجے جانے سے ڈرتا تھا اب ڈر کا ہے کا؟ بلکہ اب تو میں موت کو اپنی زندگی پر ترجیح دیتا تھا۔ نام جتنا اصرار کرتا اتنا ہی میں سخت ہوتا گیا حتیٰ کہ وہ مایوس ہو کر واپس پلٹ گیا۔ کچھ دیر بعد فوجی آئے اور مجھے روانہ کر دیا، ہم سب قیدیوں کو اس قید خانے لے جایا گیا جو آہنی کنٹینرز سے بنایا گیا تھا۔ یہاں ہمارے ہاتھ پاؤں کھولے گئے۔ ایک فوجی آیا اور قیدیوں کو پہلے سے تیار کیا گیا کھانا دیا۔ یہاں خوشی کی بات یہ تھی کہ پانچ مہینے کے بعد پانی ملا جس سے ہم وضو کر سکیں۔ میں نے جلدی جلدی وضو بنایا، نماز پڑھی اور سو گیا۔ کچھ دیر سویا تھا کہ قیدیوں کی آواز سے جاگا جو بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ رات لمبی ہو گئی تھی، کچھ بھائیوں نے کہا کہ یہاں دھوپ نہیں نکلے گی، کسی نے خیال ظاہر کیا کہ یہاں رات 18 گھنٹے کی ہو گی۔ حقیقت کوئی بھی نہ جانتا تھا، میں پھر سو گیا۔ تہجد کے لئے بھی نہ اٹھا۔ فجر کی نماز تک گہری نیند سوتا رہا، نہ فوجیوں کی آواز تھی اور نہ کتوں کے بھونکنے کی۔ صبح ہوئی نماز پڑھی' پھر گپ شپ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اندر بلاک میں باتوں پر پابندی نہ تھی اور فوجیوں کا رویہ باگرام اور قندھار میں متعین فوجیوں سے بہتر تھا۔ نسبتاً آزادی تھی مگر یہ آزادی قفس کے اندر تھی۔ ہر قید خانے کی لمبائی چھ فٹ اور اونچائی ساڑھے چار فٹ تھی۔ جستی چادر کی ایک شیٹ قید خانے کے درمیان میں ویلڈ کی گئی تھی جو چارپائی کا کام دیتی تھی۔ بیت الخلاء قید خانے کے اندر ہی بنایا گیا تھا۔ گویا نیند، خوراک، نماز اور رفع حاجت ساری ضرورتیں اتنی مختصر سے جگہ میں پوری کرنی ہوتی تھیں۔ اس جگہ کو آپ پنجرے کا نام دے سکتے ہیں۔ دو پنجروں کے مابین آہنی جالیاں تھیں، رفع حاجت کے وقت بہت مشکل پیش آتی تھی' کوشش ہماری یہ ہوتی کہ ایک دوسرے پر پردہ کر سکیں۔ ہم جس پرواز میں آئے تھے اس میں 7 افغانی بھائی تھے جبکہ باقی عرب تھے۔ ان میں خیر اللہ خیر خواہ، حاجی محمد صراف، مولوی محمد رحیم مسلم دوست، بدر الزمان، سنگین خیر اللہ اور دوسرے بھائی جن کے نام اب یاد نہیں، شامل تھے۔ ساتھی کہتے کہ یہ گوانتاناموبے نہیں عرب کا کوئی جزیرہ ہے کیونکہ آب و ہوا عرب ممالک کی طرح ہے۔ ہمیں قبلے کی سمت کا کچھ پتہ نہ تھا۔ عرب بھائی امریکیوں کے ہر قول و فعل پر شک کیا کرتے تھے۔ بعض قیدیوں کو شک تھا کہ پہرے پر مامور فوجی امریکی نہیں، عرب ہیں۔ اسی لئے وہ ان فوجیوں کے سامنے عربی میں بات نہیں کیا کرتے تھے تاکہ ان کے راز افشا نہ ہوں۔ کبھی کبھی ان فوجیوں کے منہ سے بھی عربی الفاظ نکلتے تھے مثلاً جب کسی قیدی کے سامنے آتے تو کہتے ''کیف حالک؟''

گوانتاناموبے کا پہلا کیمپ

ہمیں گوانتاناموبے میں پہلی دفعہ جس کیمپ لے جایا گیا اس کے 8 بلاک تھے۔ ہر بلاک میں 48 قیدیوں کو رکھا جاتا۔ دو پھرنے یعنی واک کی جگہیں اور 4 باتھ روم بھی تھے۔ یہ سارے بلاک لوہے کے بنائے گئے تھے، چھت اور فرش بھی آہنی تھے اور دیواریں بھی۔ دیوار میں ایک چھوٹا سوراخ ہوتا تھا جس سے ہمیں کھانا دیا جاتا تھا۔ یہ سوراخ صرف کھانے کے وقت ہی کھلتا۔ یہاں کے فوجی انتہائی بداخلاق تھے۔ قیدیوں کو انتہائی کم کھانا دیتے تھے۔ ایک بلاک کے قیدی دوسرے بلاک کے قیدیوں سے بات چیت نہ کر سکتے تھے۔ سرخ رنگ کے موٹے اور کھردرے کپڑے پہننے کے لئے دیئے جاتے۔ زیر جامہ کچھ نہ تھا جس کی وجہ سے بہت سے قیدیوں کی جلد خراب ہو گئی تھی۔ ہر قیدی کے لئے کوٹھڑی نما کمرہ مخصوص تھا جس میں دو پتلے بستر، ایک چادر، دو گلاس، ایک پانی کی بوتل، دو تولیے، ایک چھوٹی پلاسٹک شیٹ، ایک ٹوتھ برش، ایک ٹوتھ پیسٹ اور قرآن مجید کا ایک نسخہ پڑا ہوتا تھا۔ کوئی قیدی سزاوار ہوتا تو صرف پلاسٹک کی شیٹ اس کے پاس رہنے دی جاتی تھی، باقی چیزیں لے لی جاتیں۔ قیدیوں کا زیادہ تر وقت سزا میں گزرتا۔ بعد میں دوسرا کیمپ بھی بنا۔ جنرل بدل گئے جس سے شرائط میں بھی تبدیلیاں آ گئیں۔ سختیاں بڑھ گئیں اور تین مزید بلاک قائم کئے گئے، مذہبی کتابیں لے لی گئیں، روزانہ حجامت کی جانے لگی، قیدیوں کو چار کیٹگریز میں تقسیم کر دیا گیا۔ سب سے سخت شرائط والا درجہ چوتھا تھا۔ اس درجے والے قیدیوں کو صرف پلاسٹک کی ایک شیٹ دی جاتی تھی جو سردی سے بچاؤ کے لئے ناکافی تھی۔ ارزگان کے رہنے والے ملا عبدالغفور میرے پڑوسی تھے، ہر وقت سزاوار رہتے۔ امریکی تعصب ان کے لئے دن بدن بڑھتا رہا۔ وہ آخر کار اتنا تنگ آ گئے کہ جب بھی کوئی امریکی فوجی نظر آتا تو گلے پر ذبح کرنے کے انداز میں انگلی پھیر کر اپنے انداز میں امریکی فوجی کو ذبح کرنے کی دھمکی دیتے اور ہر وقت انتقام لینے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ امریکی ترجمانوں کو بھی برا بھلا کہتے تھے۔ میں ان کو بہت سمجھاتا تھا اور سزا سے ڈراتا تھا لیکن وہ نہ مانتے۔ پھر کچھ عرصہ بعد ان کی شہادت کی خبر ملی۔ اسی طرح میری گوانتاناموبے میں موجودگی کے دوران قندھار کے ملا شہزادہ کی شہادت کی خبر بھی ملی، جن کو رہا کیا جاتا تو وہ افغانستان واپسی پر پھر اتحادی فوج کے خلاف لڑنا شروع کر دیتے اور پھر گرفتار ہو کر یہاں پہنچ جاتے۔ (جاری ہے)

تلاشی کے دوران قصداً قرآن زمین پر پھینکا جاتا (چوتھا حصہ)

پاکستان میں طالبان کے آخری سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کی روداد ابتلاء

فدا محمد عدیل

قرآن رکھنے کی سزا

گوانتاناموبے میں قرآن کریم کی بے حرمتی معمول بن گیا تھا۔ امریکیوں کو بھی پتہ تھا کہ مسلمان قرآن کریم کی بے حرمتی برداشت نہیں کرسکتے، اس لئے ھماری 80فیصد سزائوں کا موجب قرآن کریم ھی تھا۔ وہ باربار قرآن کریم کی بے حرمتی کرتے اور قیدی ھر بار غیرتِ ایمانی کا مظاھرہ کرکے اپنے اپنے انداز میں اس پر احتجاج کرتے اور سزا پاتے۔ ھم کھتے کہ قرآن کریم کے بدلے کوئی دوسرا مذھبی لٹریچر دے دو مگر امریکی فوجی حکام ایسا نہ کرتے کیونکہ قیدیوں کو سزائیں دینے کا اُن کے پاس قرآن کریم کی صورت میں بھانہ موجود تھا۔ کوئی قیدی قرآن کریم اپنے پاس رکھتا تو بھی اس کو سزا دی جاتی تھی، نہ رکھتا پھر بھی سزاوار ھوتا۔ ارزگان کے رھائشی عبداللہ جن کا اصل نام خیراللہ تھا اور خیراللہ خیر خواہ کے نام سے گرفتار کرکے گوانتاناموبے پھنچایا گیا تھا، نے وھاں سے رھائی کے بعد مجھے بتایا کہ جب اس کو قندھار میں رکھا گیا تو ھر روز قیدی کی تلاشی لی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ زمین پر الٹا لٹاکر میری تلاشی لی گئی اور پاکٹ سائز قرآن مجید کا نسخہ لے کر ورق ورق کرکے پھاڑا گیا اور زمین پر پٹخ دیا۔ پھر امریکی فوجیوں کے کتے آئے اور قرآنی اوراق کو منہ میں پکڑا۔ یہ دل خراش منظر دیکھ کر میں بے اختیار کھہ اٹھا کہ اے کلام الٰھی تیرا کیا گناہ ھے، تو تو دھشت گرد نھیں ھے؟ سعودی عرب کے شاکر کھتے ھیں کہ تفتیش کار اکثر تفتیش کرتے وقت قرآن کریم کا نسخہ نیچے اپنے پائوں کے پاس رکھتا اور مجھے اس خوف سے سچ سچ بولنا پڑتا کہ یہ بدبخت میری کسی جھوٹی بات پر قرآن مجید پر پائوں نہ رکھ دے۔

افغانستان کا وفد

ایک دن مجھے اکیلے تفتیش کے نام پر اسی جگہ لے جاکر باندھا گیا جو میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ میں کسی تفتیش کار کا انتظار کرنے لگا مگر دیکھا چند افغان باشندے آئے، سلام کیا اور اِدھر اُدھر پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنا تعارف افغان حکومت کے نمائندوں کے طور پر کرایا، ان میں قندھار اور جلال آباد سے تعلق رکھنے والے دو پختون، باقی پنج شیری تھے۔ قندھاری نے پانی کا گلاس دیا پھر سوالات پوچھنا شروع کردیئے۔ سوالات وہی تھے جو امریکی پوچھتے تھے جبکہ میرے جوابات میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس دوران ایک امریکی عورت آئی جو بار بار ان افراد کے کان میں سرگوشی کرتی اور ان کو کچھ لکھا ہوا دیتی، میں نے حقیقت جاننا چاہی اور ان سے پوچھا آپ کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کی رہائی چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کا عمل اور رویہ یہ نہیں ثابت کرتا کہ آپ میری رہائی چاہتے ہیں۔ جواباً وہ سب خاموش رہے، میں بھی سمجھ گیا کہ وہ بے بس ہیں کیونکہ بات کرتے وقت بھی وہ چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے۔ میں نے ان پر یہ اعتماد بھی نہیں کیا کہ یہ ہمارے ملک کے حکومتی نمائندے ہوں گے کیونکہ ان کی صلاحیتیں انتہائی کم معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے بارے میں دوسرے قیدیوں کے بھی میری طرح کے تاثرات تھے۔ بعض قیدی تو ان کے سوالوں کا جواب گالیوں کی صورت میں دیتے تھے۔ وہ تفتیش میں امریکیوں سے بھی سخت تھے اور خود کو لاعلم ظاہر کرتے تھے۔ چونکہ امریکیوں کے لئے کام کرتے تھے اس لئے قیدی بھی ان کے ساتھ نرمی نہیں برتتے تھے۔ چند دن بعد 16 جون 2004ء کو مجھے واپس چوتھے کیمپ منتقل کردیا گیا جہاں مجھے ایک سال اور چند مہینے رکھا گیا۔

چشم دید واقعات

مجھے تین سال چھ مہینے تک مختلف کیمپوں میں قید خانوں میں رکھا گیا۔ اس دوران ایسے ایسے واقعات دیکھے جو دل ہلا دینے والے تھے اور جنہیں اب بھی یاد کرتا ہوں تو رونا آجاتا ہے۔ امریکی فوجی قیدیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھتے تھے وہ مسلمہ انسانی و بین الاقوامی قوانین کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ 2003ء میں رمضان المبارک میں دو دن باقی تھے، امریکی آئے اور کہا کہ رمضان المبارک کے احترام میں آپ کو دگنا کھانا دیا جائے گا۔ افطاری کے وقت جوس اور کھجوریں بھی دی جائیں گی۔ یہ ہمارے لئے بہت خوشی کی بات تھی مگر ان کی یہ بات اعلانات تک محدود رہی۔ صبح ہوئی تو ان کا سلوک اور بھی برا ہوگیا۔ بلاک کے آخری حصے میں تین قیدیوں نے فوجیوں کے ساتھ لڑائی کی، ایک قیدی نے فوجی پر پانی ڈالا، اس کی سزا پورے کیمپ کے قیدیوں کو رمضان پیکج واپس لے کر دی گئی اور فوجیوں نے مزید وحشیانہ سلوک شروع کردیا۔ ہم نے بارہا امریکی فوجی افسروں سے کہا کہ صرف ایک شخص کی سزا باقی تمام قیدیوں کو کیوں دی جارہی ہے؟ آپ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں اور رمضان المبارک کا احترام ممکن بنائیں۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم فوجی ہیں اور ہمارا قانون یہ ہے کہ ایک آدمی کی سزا سب کو دیتے ہیں۔ یہ ایسا جھوٹ تھا جسے ہم خوف کے مارے جھوٹ نہیں کہہ سکتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بدشکل خاتون فوجی نے قیدیوں کی تلاشی کے دوران قصداً دو مرتبہ قرآن مجید کو زمین پر پھینکا۔ قیدیوں نے اس بے حرمتی پر خاتون فوجی کو سزا دینے کا مطالبہ کیا مگر امریکی فوجی حکام نے اس مطالبے پر کان نہیں دھرا۔ پہلے کیمپ کے قیدیوں نے اس ظلم پر ہڑتال شروع کردی تھی جس کا دوسرے اور تیسرے کیمپ کے قیدیوں نے بھی ساتھ دیا۔ قیدیوں نے نہانے کی جگہ جانے، کپڑے بدلنے اور کھیل و تفریح کے اوقات میں باہر نکلنے کا بائیکاٹ کردیا جس پر بارہ امریکی فوجیوں نے قیدیوں پر یلغار کردی۔ وہ قیدیوں کو پکڑ پکڑ کر ان کی مونچھیں، داڑھی اور ابرو صاف کردیتے، کسی کی آدھی داڑھی چھوڑ دیتے اور کسی کی ایک مونچھ۔ اس ظلم و زیادتی پر باقی قیدی اللہ اکبر کے نعرے لگاتے جبکہ بعض فوجیوں کو گالیوں اور بددعاؤں سے نوازتے۔ اس دوران افواہ آئی کہ امریکی فوجیوں نے سعودی عرب کے مشعل نامی قیدی کو اس قدر تشدد کا نشانہ بنایا کہ انہوں نے جام شہادت نوش کرلیا ہے۔ اس افواہ سے حالات مزید سنگین ہوگئے۔ اب فوجی بڑے بڑے مضبوط ڈنڈے اٹھائے پھرتے تھے۔ ایسی گاڑیوں کا گشت مختلف کیمپوں میں شروع ہوا جن پر توپیں اور مشین گنیں نصب تھیں۔ عصر کا وقت تھا جب عربی، انگریزی اور اردو میں اعلان ہوا کہ مشعل کی حالت نازک ہے، ان کی صحت یابی کے لئے دعا کریں۔ اس اعلان سے قیدی بھی خاموش ہوگئے اور اس تجسس میں مبتلا ہوگئے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ اور پھر ہمارے ہم خیال ایک قیدی نے جو اسپتال سے آیا تھا، بتایا کہ انہوں نے مشعل کو دیکھا ہے، اس کی حالت واقعی خراب ہے اور پھر دو تین مہینے بعد پتہ چلا کہ مشعل پر فالج کا حملہ ہوگیا ہے اور اس کے تمام اعضاء شل ہوگئے ہیں۔ امریکی فوجیوں نے مشعل کو تشدد کا نشانہ کیوں بنایا تھا اس کا ہمیں آخر تک پتہ نہ چل سکا۔ مشعل نے دو سال چھ مہینے اسپتال میں گزارے، اس کو وہیل چیئر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا تھا، اتنا معذور تھا کہ بغیر سہارے کے نہ کھڑا ہوسکتا تھا اور نہ بیٹھ سکتا تھا۔ آخر میں اسے سعودی حکومت کے حوالے کردیا گیا۔

پہلے پہل ہر کیمپ میں کھانے اور پھل وغیرہ کی اچھی خاصی مقدار ملتی تھی۔ پھر ہر کیمپ کے انچارج نے عجیب رویہ اختیار کرنا شروع کردیا۔ ہوا یوں کہ ایک فوجی بار بار ہر قیدی کے پاس جاتا اور کھانے کے مینو، پسند ناپسند اور کمی بیشی کے بارے میں پوچھتا اور ایک نوٹ بک میں تحریر کرتا جاتا۔ نتیجہ اس عجیب کام کا یہ نکلا کہ کھانے پینے کی جو چیز قیدیوں کو پسند نہیں تھی اس کی مقدار بڑھائی گئی اور جس چیز کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا گیا اس کی مقدار کم کردی گئی۔ خوراک کی اچھی چیزیں غائب ہوگئیں جبکہ ناکارہ اشیائے خورونوش میں اضافہ کردیا گیا۔ وقت کے ساتھ مشکلات بڑھتی گئیں۔ آغاز میں تفتیش یا ریڈ کراس والوں سے ملنے یا ڈاکٹر کے پاس لے جاتے وقت ایک پٹے سے باندھا جاتا جو بعد میں زنجیر میں تبدیل ہوگیا اور پھر زنجیر سے پاؤں اور ہاتھوں کو بھی باندھا جانے لگا۔ ہتھکڑی ایک کی بجائے تین تین پہنائی جانے لگیں۔ پہلے آنکھیں بند نہ کی جاتی تھیں۔ پانچویں کیمپ میں آنکھوں پر پٹی باندھنا اور کانوں میں روئی ٹھونسنا عام سی بات بن گئی تھی، پہلے مذہبی کتابوں پر کوئی پابندی نہیں تھی جو بعد میں عائد کردی گئی۔ اقتصادیات، ریاضی، بیالوجی، سیاست، تاریخ اور جغرافیہ کے موضوع پر مبنی کتابیں بھی بند کردی گئیں۔ نیند پوری نہ لینے دی جاتی تھی۔ ملا خوند کو 40 دن اور رات تک نیند نہ کرنے دی گئی، اس کو سخت سردی میں بھی ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھا گیا۔ فوجی گھی کے خالی کنستر بجاتے تاکہ قیدی نہ سوسکیں۔ قیدیوں خصوصاً عرب قیدیوں کو موٹر لانچ میں بٹھا کر فل اسپیڈ کے ساتھ چلائی جاتی۔ رفتہ رفتہ علاج کی سہولتیں کم ہوتی گئیں۔ ڈاکٹر، ابتدائی مراحل میں آزاد تھے اور مریض قیدیوں کو دوائیاں بھی دیتے تھے مگر رفتہ رفتہ ان پر بھی پابندیاں عائد ہوگئیں اور قیدیوں پر توجہ بالکل نہ دی جاتی۔ خون کے کینسر میں مبتلا قندھار کے ولی محمد نامی قیدی کی تکلیف سے چیخیں نکل جاتیں مگر اس کے پاس کسی معالج کو نہیں بھیجا گیا، نتیجتاً اس کا سارا جسم سوج گیا۔ ہم مجبور ہوگئے کہ اس کے لئے احتجاج شروع کریں۔ ہم نے زور زور سے نعرۂ تکبیر بلند کرنا شروع کردیا اور قید خانے کی آہنی دیواروں کو مار مار کر شور مچانا شروع کردیا جس سے فوجیوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ فوجیوں نے اپنے افسروں کو بلایا، ترجمان کو لایا گیا پھر جاکر مریض کو کلینک لے جایا گیا جہاں اس کے مرض (بلڈ کینسر) کی تشخیص کی گئی۔ کینسر نے اس کے جگر کو بھی متاثر کیا تھا۔ اگر ولی محمد کا بروقت علاج ہوتا تو اس کا مرض اتنا نہ بڑھتا۔ ہم کبھی کبھار جنیوا کنونشن کے تحت اپنے حقوق یاد دلاتے تو امریکی فوجی کہتے کہ جنیوا جاکر اپنے حقوق حاصل کرلو، یہ امریکہ ہے۔ ہم سے تفتیش کے دوران کوئی بامقصد جواب نہ پاتے اور تشدد کرکے تھک جاتے تو آخر میں خود اپنے صدر بش کو گالیاں دینا شروع کردیتے۔ کبھی میڈیا کے لوگ یا حکومتی عہدیدار تماشا دیکھنے آتے تو سارے کیمپوں کا معائنہ کرانے کی بجائے ان کو صرف 4th Camp کا دورہ کرایا جاتا کیونکہ اس کیمپ کے حالات اچھے تھے۔ ایسے وفود کو دکھانے کے لئے نمائشی جگہیں بنائی گئی تھیں۔ اکثر مریضوں کو دورے کے اوقات میں نشہ دیا جاتا تھا تاکہ وہ سوئے رہیں اور امریکی وحشیانہ سلوک کا بھانڈا نہ پھوڑ سکیں۔ ایک مرتبہ چوتھے کیمپ کے دو قیدیوں نے ایک وفد کے ارکان کو بتایا کہ یہ نمائشی کیمپ ہے' آپ اگر حقیقت جاننا چاہتے ہیں تو پہلے، دوسرے، تیسرے، پانچویں اور ایکو کیمپ کے قیدیوں اور مریضوں کا حال دیکھیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم انصاف چاہتے ہیں' ہم دہشت گرد نہیں ہیں، ہمیں عدالت میں پیش کیا جائے تاکہ پتہ لگے کہ کتنے بے گناہوں کو دہشت گردی کے کھاتے میں سخت ترین عذاب سے گزارا جارہا ہے۔ امریکی فوج نے بعد میں شکایت کرنے والے تین افراد کو سزا کا مستحق قرار دے کر ان کو چوتھے کیمپ سے باہر نکالا اور ساری مراعات اور سہولیات واپس لے لیں۔ (جاری ہے)

پشاور اور اسلام آباد میں رہنے والے پاکستانی تاجروں کو پاکستانی اہلکاروں نے لوٹا
پھر امریکا کے ہاتھوں فروخت کر دیا (پانچواں اور آخری حصہ)
پاکستان میں طالبان کے آخری سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کی روداد ابتلاء
فدا محمد عدیل

ایک دن تیمم کر کے ہم باجماعت نماز پڑھ رہے تھے' میں امامت کر رہا تھا۔ اس دوران آواز آئی کہ عادل تیونسی تفتیش کیلئے حاضر ہو۔ ہم چونکہ نماز پڑھ رہے تھے اس لئے فوری عملدرآمد نہ ہوسکا۔ ہم سجدے میں تھے کہ دو فوجی میرے سر اور کمر پر بیٹھ گئے' میں سجدے سے نہ اٹھ سکا' چنانچہ نماز خراب ہوگئی' پھر عادل کو نماز کے دوران ہی زبردستی لے جایا گیا۔ ہم نے سلام پھیرا اور ازسرنو نماز پڑھنا شروع کی۔ ہونا یہ چاہئے کہ ہر حالت میں مذہبی شعائر کا احترام کیا جائے' دنیا کے تمام مسائل مذاہب کا احترام نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔
کھانا چونکہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر کھانے کی پابندی تھی اس لئے ایک مرتبہ آدھ گھنٹہ سے زیادہ وقت لینے پر ایک پاکستانی قیدی کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ہمارے پڑوس کے خیمے میں اس پاکستانی بھائی کو دانتوں کا شدید درد تھا' نرسیں ہر مرض کیلئے "Tatinol" نامی گولیاں دیتی تھیں' اس کو بھی یہی گولیاں دی گئیں مگر اس کا درد بڑھتا گیا۔ وہ اس درد کی وجہ سے کھانا نہیں کھاسکتا تھا۔ ایک بندرنما نیلی آنکھوں والا چھوٹے قد کا امریکی فوجی آیا اور مقررہ وقت کے اندر کھانا نہ کھانے پر اس کی سرزنش شروع کر دی۔ پاکستانی بھائی نے کہا کہ مجھے تھوڑا سا اور وقت دیں' میں معذور ہوں۔ یہ سن کر فوجی نے اس کو خیمے کے دروازے کی طرف کھینچ کر اس پر مکوں کی بارش کردی۔ پاکستانی بھائی کے ساتھ اس غیر انسانی سلوک پر ہم نے رات کو بھوک ہڑتال کردی اور کھانا کھانے سے انکار کردیا۔ وہ وحشی فوجی چونکہ قرآن مجید کی بے حرمتی بھی کیا کرتا تھا' اس لئے قیدیوں کو اس سے دوھری نفرت ہوگئی تھی۔ بعدازاں دوسرے فوجیوں کی اس یقین دھانی پر کہ آئندہ اس قسم کا سلوک نہ ہوگا' ہم نے بھوک ہڑتال ختم کردی۔ ایک دن میں سورہا تھا' باقی ساتھیوں میں سے کوئی تلاوت میں مصروف تھا' کوئی وظیفہ پڑھ رہا تھا اور چند ساتھی شطرنج کھیلنے میں مصروف تھے۔ ایک یمنی بھائی کو شطرنج کے کھیل سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ کہتا تھا' امام شافعیؒ نے اس کھیل کو روا قرار دیا ہے۔ میں اچانک رونے کی آواز سن کر جاگ اٹھا' دیکھا کہ چند ساتھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں اور سب انتہائی افسردہ ہیں۔ میں نے پوچھا کیا ماجرا ہے تو سعودی عرب کے محمد نواب نامی ساتھی نے اسی بڑے سر والے امریکی فوجی کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ اس نے ہماری طرف دیکھ دیکھ کر قرآن مجید کی بے حرمتی کی اور اسے اس ڈرم میں پھینک دیا جو آدھا زمین کے اندر دھنسا ہوا تھا اور جس میں قیدی پیشاب کیا کرتے تھے۔ یہ ماجرا سن کر میرا بھی خون کھولنے لگا اور انتہائی افسوس ہوا۔ یہ ہمارے لئے دردناک ترین واقعہ تھا۔ اس واقعے کو کچھ عرصہ بعد "نیوز ویک" نے بھی رپورٹ کیا مگر اس نے گوانتاناموبے سے اس واقعے کو منسوب کیا حالانکہ درحقیقت یہ دل ہلادینے والا واقعہ قندھار میں ہوا تھا۔ اس کے بعد ہم نے ریڈکراس والوں سے کہا کہ ہم سے قرآن پاک کے نسخے واپس لے جائیں کیونکہ ہم یہاں اپنی مقدس کتاب کی حفاظت سے قاصر ہیں' مگر ریڈ کراس والوں نے ہماری بات نہیں مانی۔ یا تو وہ ایسا کرنا نہیں چاہتے تھے یا پھر کر نہیں سکتے تھے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی بے حرمتی معمول بن گئی۔ ہمیں ذھنی تشدد کا نشانہ بنانے کیلئے کتے لائے جاتے جو قرآن کریم کے نسخوں کو سونگھتے' پھر فوجی ان نسخوں کو انتہائی بیدردی سے زمین پر پھینک دیتے۔ یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک میں قندھار میں رہا۔

گوانتاناموبے میں بوسنیا سے تعلق رکھنے والے شیخ جابر، ابوشیما محمد، مصطفیٰ اور الحاج بھی قید تھے جو بہت ہی مظلوم تھے۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ گوانتاناموبے کیوں لایا گیا ہے اور ان کا جرم کیا ہے؟ ابوشیما کو تو سزا کے لئے پانچویں کیمپ بھی لے جایا گیا۔ شیخ جابر نے مجھے بتایا کہ ہم نے ہر تفتیش کار سے اپنا قصور پوچھا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ بعض کہتے کہ آپ امریکی مفادات کے لئے خطرہ ہیں۔ ہم ثبوت مانگتے تو کہتے کہ ثبوت ضروری نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ نے ماضی میں کچھ کیا ہو۔ ہوسکتا ہے آپ مستقبل میں امریکی تنصیبات پر حملہ کریں اور امریکیوں کو نقصان پہنچائیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان پانچوں بوسنیائی بھائیوں نے زندگی میں نہ کبھی افغانستان دیکھا تھا اور نہ کسی تنظیم سے ان کا تعلق تھا، ان کا گناہ صرف یہ تھا کہ انہوں نے سربوں کے خلاف جہاد لڑا تھا۔
میں نے بحیثیت افغان سفیر کئی بار اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کی تنظیموں سے رابطہ کیا تھا کہ افغانستان میں طالبان قیدیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کا نوٹس لیا جائے اور بے گناہ افراد کو رہا کیا جائے۔ مجھے ہر بار یقین دہانیاں کرائی گئیں۔ اپنی گرفتاری سے قبل حامد کرزئی اور جنرل پرویز مشرف دونوں سے مسلسل رابطہ رکھا اور ان سے مطالبہ کیا کہ افغانستان کے شمال میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے ان کو رہا کیا جائے اور ان سے وحشی سلوک روکا جائے مگر دونوں بے بس نظر آتے تھے۔ غسان جو عرب تھا، نے بتایا کہ میں اپنے چند ساتھیوں سمیت لاہور کے ایک ہوٹل میں کرائے کے عوض کمرہ لے کر اس انتظار میں بیٹھا تھا کہ کسی طریقے سے پاکستان سے باہر نکل سکوں۔ پاکستان سے باہر جانا آسان تھا مگر اس کے لئے رقم کی ضرورت تھی جو میرے پاس نہیں تھی۔ باہر بھجوانے کا کام پاکستانی اہلکار باقاعدہ مک مکا کر کے کرتے تھے۔ جب سودا طے نہ ہوا تو انہی اہلکاروں نے چھاپہ مار کر گرفتار کرلیا۔ انہوں نے جب چھاپہ مارا تو ہمارے پاس سبزی کاٹنے والی چھریاں تھیں جبکہ ان کے پاس بھاری اسلحہ تھا۔ اس کے باوجود ہم نے خوب مزاحمت کی، ہماری مزاحمت دیکھ کر اہلکاروں نے کہا کہ ہم آپ کی مدد کر رہے ہیں، ہم نے کہا کہ نہیں آپ کے ساتھ امریکی ہیں اور ہم خود کو امریکا کے حوالے نہیں کریں گے۔ اہلکاروں نے کہا کہ آپ کو امریکہ کے حوالے کرنے نہیں بلکہ پوچھ گچھ کرنے کے لئے گرفتار کیا جارہا ہے۔ ہم نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے دیئے اور کہا کہ ہم مسلمان ہیں اور عرب مجاہدین ہیں مگر وہ نہیں مانے۔ محاصرہ کر کے جب انہوں نے ہمیں گرفتار کرلیا تو بااثر دکھائی دینے والے چند افراد آئے اور قسم اٹھا کر کہا کہ ہم لشکر طیبہ کے لوگ ہیں اور آپ کے ساتھی ہیں، آپ مزاحمت نہ کریں۔ پھر ان پاکستانی اہلکاروں نے پہلے ہمیں لوٹا اور پھر امریکی فوجیوں کو لایا گیا کہ آئیں دیکھیں ہم کس طرح آپ کے لئے مخلصانہ کوششیں کر رہے ہیں۔ دو افراد جو مصنفین تھے اور جلال آباد سے ان کا بنیادی تعلق تھا، پاکستان میں اپنے ذاتی مکانات میں رہائش پذیر تھے۔ ان میں ایک دینی کتابوں کے مصنف عبدالرحیم مسلم دوست اور دوسرے انگریزی زبان کے استاد بدرالزمان بدر تھے۔ پاکستانی اہلکاروں نے ان دونوں افغان مہاجروں کو گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کردیا۔ ان دونوں کا طالبان سے کوئی واسطہ نہ تھا، یہ دونوں تین مہینے تک ایک پاکستانی ادارے کی تحویل میں رہے پھر ان کو امریکی تحویل میں دے دیا گیا۔ ان دونوں کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ ظلم نہیں دیکھ سکتے تھے اور پاکستان پر تنقید کرتے تھے۔
ولی محمد صراف، عبدالرحمٰن نورانی اور بعض دیگر ایسے بڑے بڑے تاجر جو پشاور یا اسلام آباد میں رہتے تھے اور بہت مالدار تھے، سے پاکستانی اہلکاروں نے بھاری رقم لوٹی اور پھر امریکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا جو اب بھی گوانتاناموبے میں زندگی کی قبروں میں پڑے ہیں۔ عرب مجاہدین کے ساتھ جو سلوک پاکستان میں ہوا وہ گوانتاناموبے میں بھی نہیں ہوا۔ گوانتاناموبے کے قیدی پاکستان کو "مجبورستان" کہہ کر پکارتے۔
گوانتاناموبے میں تفتیش کے مراحل بڑے عجیب تھے۔ تفتیش کا محور کوئی خاص ایشو نہیں تھا۔ نہ تفتیش کاروں کے ہدف کا پتہ چلتا اور نہ یہ بات پتہ چلتی کہ ان کو تلاش کس کی ہے؟ ہر روز نئے نئے سوال پوچھے جاتے، کبھی کبھی پرانے سوالات دوہرائے جاتے، جرم کی باتیں پیچھے رہ جاتیں۔ ایک بار تفتیش کرنے والے نے کہا کہ یمن میں بحری جہاز تباہ کیا گیا تھا جس میں گیارہ امریکی عہدیدار ہلاک ہوئے تھے۔ اس واقعے میں آپ کا ہاتھ تھا اور آپ اُس وقت یمن میں موجود بھی تھے۔ میں نے کہا کہ میں کیسے گیا تھا یمن؟ اور کس راستے سے گیا تھا؟ اس نے کہا کہ ایران سے قطر اور قطر سے یمن گئے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ کو بحری جہاز کے آنے کا وقت اور جانے کا وقت معلوم تھا؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا میں دھماکہ خیز مواد اپنے ساتھ لے کر گیا تھا یا نہیں؟ اس نے کہا معلوم نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو اپنے بحری جہاز کے لنگرانداز ہونے کا وقت اور جگہ معلوم نہیں تو میں کس طرح نامعلوم بحری جہاز میں ایران، قطر اور پھر یمن گیا؟ اگر کوئی یہ ثابت کرے کہ میں نے آج تک ایران، قطر یا یمن دیکھا ہے تو میں آپ کا ہر الزام تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں۔
شاید یہ سارے تفتیش کار ہم سب قیدیوں کو انتہائی سادہ سمجھتے تھے اور ہم سے ایسے پیش آتے جیسے ہم بچے ہوں۔ ایک دن ایک چھوٹے قد کے موٹے شخص نے آکر انتہائی بدتمیزی سے بات شروع کی، میرے جوابات پر طنزیہ انداز میں مسکرا بھی دیتا اور آخر کار اس نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو اس کے دل میں معلوم نہیں کب سے جاگزیں تھا۔ اس نے پوچھا: یہ مسلمان آخر کب ہمارے سامنے سر تسلیم خم کریں گے؟ اس سوال سے میرا خون کھول اٹھا مگر میں نے حوصلہ کر کے جواب دیا کہ آپ کی خواہش کبھی بھی پوری نہیں ہوگی۔ مسلمانوں کا ایک ٹولہ آپ کے خلاف امام مہدی کے ظہور تک جہاد کرے گا اور آخر میں غلبہ مسلمانوں کا ہی ہوگا۔ اس نے پوچھا یہ ٹولہ کس کا ہوگا؟ طالبان کا یا القاعدہ کا؟ یا کسی اور کا؟ میں نے کہا کہ یہ مجھے معلوم نہیں مگر یہ یاد رکھیں کہ آپ اپنے اپنے اہداف تک اس قدر آرام سے نہیں پہنچیں گے۔ اس نے لمبی سانس لی اور کہا کہ کاش یہ امام مہدی جلدی سامنے آئیں اور ہم ان سے نمٹیں تاکہ مسلمانوں کی یہ آخری امید بھی ختم ہو۔ میں نے کہا کہ ہمیں بھی ان کے ظہور کا شدت سے انتظار ہے۔
ایک مرتبہ قیدیوں نے بھوک ہڑتال شروع کردی۔ بعض قیدی کھانا نہ کھاتے مگر پانی پیتے تھے، بعض نے کھانا پینا دونوں ترک کردیا۔ عرب بھائیوں نے تادم مرگ بھوک ہڑتال شروع کی۔ اس طرح 275 افراد کھانے سے محروم تھے۔ وہ صرف اور صرف احترام انسانیت چاہتے تھے۔ بھوک ہڑتال 26 روز سے جاری تھی، ہر پانچ میں سے چار قیدیوں نے بھوک ہڑتال میں حصہ لیا، صرف سفید ریش مریضوں نے ہڑتال میں حصہ نہیں لیا۔ کیمپ کے انچارج جنرل نے قیدیوں کو یقین دہانی کرائی کہ جنیوا کنونشن کی بعض شقوں کے تحت قیدیوں کو حقوق دیئے جائیں گے مگر اس کے لئے شرط یہ ہے کہ قیدی بھوک ہڑتال ختم کردیں۔ کیمپ کے انچارج سعودی عرب کے شیخ شاکر جن کے پاس برطانوی شہریت تھی اور جن کو انگلش زبان پر عبور حاصل تھا، کو ہر قیدی کے پاس لے جایا جاتا اور ان کے ذریعے قیدیوں کو یقین دہانیاں دے دے کر کھانا کھانے پر راضی کیا جاتا۔ قیدیوں نے ہڑتال ختم کی اور کھانا کھانا شروع کیا۔ قیدیوں کی جانب سے چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی جسے قیدیوں کے مطالبات ترتیب دینے اور امریکی حکام کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس کمیٹی میں شیخ شاکر، شیخ عبدالرحمٰن، شیخ غسان، شیخ جابر، شیخ ابوعلی اور میں (عبدالسلام ضعیف) شامل تھے۔ مذاکرات کے لئے دو مرتبہ کوشش کی گئی مگر بار آور ثابت نہ ہوسکی۔ آخر کار تیسری مرتبہ 7 اگست 2005ء کو کیمپ کے داخلی دروازے کے پاس اجلاس ہوا جس میں کمیٹی کے ہم چھ ارکان کیمپ کے انچارج بمب گارنر، ایک کمانڈر اور ایک دوسرا شخص شامل تھا، بمب گارنر بہت چالاک اور عیار تھا، قیدیوں کو کہتا تھا کہ میں ابلیس شیطان ہوں۔ اس نے اجلاس کی ابتدا میں ہی کہا کہ میں کیمپ کو پرامن اور مسئلوں سے پاک دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ قیدی آپ (کمیٹی کے چھ ممبران) کی بات مانتے ہیں، میں آپ کے فیصلوں کا احترام کروں گا، میں نے امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ سے بات کی ہے تاکہ آپ کو جنیوا کنونشن کے مطابق حقوق دیئے جائیں البتہ اس بات کا فیصلہ ہم کریں گے کہ کون

سے حقوق دیئے جائیں اور کون سے نہ دیئے جائیں۔ ہم نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، مذہبی شعائر کی بے حرمتی اور امریکی فوجیوں کے غیر قانونی اور غیر انسانی اقدامات کی شکایت کی۔ ہم نے کہا کہ چار سال تک دنیا کو ورغلایا گیا کہ گوانتاناموبے میں دہشت گردوں کو رکھا گیا ہے، یہ سلسلہ اب بند کیا جائے۔ خود کو شیطان کہنے والا کیمپ کا انچارج سب کچھ مانتا اور کہتا کہ جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ آپ کے ساتھ انسانی سلوک کیا جائے گا۔ مگر اس کے یہ سارے وعدے جھوٹ ثابت ہوئے۔ اجلاس میں شرکت کرنے والے قیدیوں کو باقی قیدیوں سے الگ کر دیا گیا اور ظلم وستم کا سلسلہ مزید دراز کر دیا گیا۔ بھوک ہڑتال پھر شروع کر دی گئی، تین سو سے زائد قیدی بھوک ہڑتال کے لئے تیار ہوئے، بیس قیدیوں نے تو پکا عزم ظاہر کیا کہ وہ تادم مرگ بھوک ہڑتال جاری رکھیں گے اور امریکیوں پر مزید اعتماد نہیں کریں گے۔ امریکہ کے اوپر بداعتمادی کا یہ سلسلہ میری رہائی یعنی 11 ستمبر 2005ء تک جاری رہا۔ بھوک ہڑتال کے باعث اسپتال مریضوں سے بھر گیا، ان کو بے ہوشی کی حالت میں دوا دی جاتی، قیدی ہوش میں آتے تو ڈرپ وغیرہ اتار کر پھینک دیتے اور دوائیاں کھانے سے انکار کر دیتے، انتہائی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے اور مرنے تک بھوک ہڑتال جاری رکھنے کا عزم ظاہر کرتے۔ پھر وہ مرحلہ بھی آیا جب پانچ ڈاکٹروں نے مل کر بے ہوش مریضوں کو نتھنوں میں پائپ لگا کر خوراک دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سننے میں آرہا ہے کہ گوانتاناموبے میں حقوق کے لئے قیدیوں کی ہڑتال کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

گوانتاناموبے کا مقصد کیا ہے؟

گوانتاناموبے میں وقت کے فرعون کے مظالم سہنے والا ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ زندان ہر اس مسلمان کے لئے بنایا گیا ہے جو امریکی پالیسیوں کا مخالف ہے۔ جہاں امریکہ جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ دہشت گردی کے نام پر گرفتار ہونے والوں کے ساتھ امریکہ ہر غیر قانونی سلوک کر سکتا ہے کیونکہ گوانتاناموبے کے جزیرے میں دنیا کا کوئی قانون نہیں چلتا۔ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ صدر بش نے دنیا کے سامنے جو جھوٹ بولا وہ محض دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے تھا۔ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ گوانتاناموبے کے اکثر قیدی بے گناہ ہیں۔ بہت سے ایسے ممالک جو امریکی اتحادی ہیں، اپنے کئے پر پشیمان ہیں، ان کے سامنے امریکہ کا بھیانک چہرہ بے نقاب ہو چکا ہے مگر مجبور ہیں۔ یہ ممالک اپنی مجبوری کے تحت امریکی مظالم پر خاموش ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ گوانتاناموبے کے بدنام زمانہ عقوبت خانوں کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ اس سے امریکہ کو کیا فائدہ ہے؟ میری نظر میں فائدہ کوئی نہیں سراسر امریکہ کا اپنا نقصان ہے۔ یہ گوانتاناموبے امریکی ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے مگر اس کا مکمل ادراک دنیا اور خود امریکی عوام کو مستقبل میں ہوگا۔ صدر بش نے ثابت کر دیا ہے کہ احترام آدمیت اور انسانی حقوق صرف طاقتور اقوام کے لئے ہیں اور مظلوم مسلمانوں کو کسی قسم کا حق حاصل نہیں۔ امریکہ نے مسلمانوں کو انسانی حقوق کا غاصب اور قانونی مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی مگر خود گوانتاناموبے کی وجہ سے دنیا بھر میں امریکہ کو انسانی حقوق کا غاصب خصوصاً مسلمانوں کا دشمن سمجھا گیا۔ دنیا نے جان لیا کہ امریکہ ریاستی اور بین الاقوامی قوانین کو پاؤں تلے روندنے والا ملک ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں میں امریکہ سے نفرت بڑھی۔ یہ ایسے نکات ہیں جن کی وجہ سے ہر گزرتے دن کے ساتھ امریکی وقار کو ٹھیس پہنچ رہی ہے۔ گوانتاناموبے کی وجہ سے امریکہ نے یہاں کے ہر قیدی کو اپنا دشمن بنا لیا، قیدیوں میں ایسے بھی تھے جو امریکی پالیسیوں کے خلاف نہ تھے مگر جب امریکی مظالم انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تو وہ بھی امریکا کے سخت ترین دشمن بن گئے۔ گوانتاناموبے کے زندان کی وجہ سے امریکہ نے ''شخصیات'' پیدا کیں، بہت سے ایسے لوگ جن کو کوئی پہچانتا بھی نہ تھا گوانتاناموبے کی وجہ سے وہ لوگوں کے ہیرو اور رہبر بن گئے، اب اگر یہ ہیرو امریکہ کے خلاف کچھ کرنا چاہیں تو ایک اشارے پر بہت کچھ کر سکتے ہیں اور ہر ایک شخص باقاعدہ اپنی مؤثر جماعت بنا سکتا ہے۔ کہتے ہیں احمق دوسروں کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتا جتنا اپنے آپ کو۔ اگر دہشت گردی کا مطلب لوگوں کو خوفزدہ کرنا ہے تو سب سے بڑا دہشت گرد تو خود امریکہ ہے جس نے گوانتاناموبے کی صورت میں معصوم اور بے گناہ مسلمانوں کو اپنے ظالمانہ سلوک سے ڈرانے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔

میری رہائی کی خوشخبری

11 مئی 2004ء رمضان المبارک کو مجھے تفتیش کے لئے لے جایا گیا، یہ جگہ میری لئے نئی تھی۔ جس کمرے میں مجھے بٹھایا گیا وہاں ایئر کنڈیشنر اور ٹی وی بھی لگا ہوا تھا۔ خلاف معمول میرے ہاتھ پاؤں کھولے گئے۔ کچھ دیر کے بعد ایک افغان اور تین امریکی آئے۔ دو امریکی تفتیش کار تھے جبکہ تیسرے نے امریکہ کے افغانستان میں قائم سفارت خانے کے اہلکار کے طور پر اپنا تعارف کرایا۔ افغان باشندے نے خود کو افغان حکومت کا ایلچی بتایا مگر مجھے یقین نہیں آیا، باتیں شروع ہوئیں تو ان کا رویہ بڑا شائستہ تھا۔ انہوں نے مجھے کھانا کھلایا جس کو میں صحیح معنوں میں کھانا کہوں گا جو چار سال بعد مجھے نصیب ہوا تھا۔ میں نے حد سے زیادہ کھانا کھایا، کھانے کے ساتھ فروٹ اور کولڈ ڈرنک بھی دی گئی۔ ان افراد نے وعدہ کیا کہ وہ میری رہائی کے لئے بھرپور کوشش کریں گے مگر اس کے بعد بھی ایک سال تک گوانتاناموبے میں رہا۔ میں رہا ہونا چاہتا تھا مگر مجھے شرائط معلوم نہ تھیں۔ یکم نومبر 2005ء کو ایک تفتیش کار نے خوشخبری سنائی کہ اگلے ہفتے آپ کو رہا کر دیا جائے گا مگر اس سے پہلے آپ کو کسی دوسری جگہ منتقل کیا جائے گا' گھبرانا نہیں۔ دوسرا ہفتہ شروع ہو گیا، پہلے ہی دن مجھے ایسی جگہ لے جایا گیا جس کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، یہ جگہ زندگی کی تمام سہولتوں سے آراستہ تھی۔ پہلی دفعہ میں نے اپنے لئے یہاں خود قہوہ پکایا جس کا مجھے بڑے عرصے سے ارمان تھا۔ دوسرے دن چار بجے کے قریب ایلچی آیا اور میرے ساتھ بیٹھ کر میرے گھر اور افغانستان کے حالات کے متعلق معلومات فراہم کیں اور کہا کہ کل رات بارہ بجے آپ کی افغانستان کے لئے پرواز ہوگی۔ اس وقت تک آپ آرام کریں۔ تیسرے دن مجھے پھر اس جگہ لے جایا گیا جہاں پہلے سزا دی جاتی تھی مگر امید تھی کہ ریڈ کراس کے لوگ آئیں گے۔ معمول تو یہی تھا کہ رہائی کے وقت ریڈ کراس کے لوگ قیدی سے ملتے' مگر اچانک چند امریکی ویڈیو کیمروں کے ساتھ اندر آئے، ان کے ساتھ ایک پشتو ترجمان بھی تھا، ایک دو سیاہ کاغذات ان کے ہاتھ میں تھے جس پر انگریزی میں کچھ لکھا گیا تھا اور ساتھ میں پشتو ترجمہ بھی تھا۔ کاغذ میرے حوالے کیا گیا اور کہا گیا کہ اس پر دستخط کریں۔ کاغذ پر درج شقیں کچھ اس طرح تھیں۔

(1) قیدی اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے، یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ سے معافی مانگتا ہے، امریکہ کی طرف سے جرم کی معافی اور رہائی پر اس کا شکر گزار ہے۔

(2) قیدی القاعدہ اور طالبان کا ساتھی تھا، آئندہ دونوں کے ساتھ تعلق نہیں رکھے گا اور ان کے ساتھ تعاون نہیں کرے گا۔

(3) قیدی آئندہ دہشت گردی کی کارروائیوں میں حصہ نہیں لے گا۔

(4) قیدی آئندہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے مفادات کے خلاف کوئی کام نہیں کرے گا۔

اگر قیدی نے ان شقوں کی خلاف ورزی کی تو اسے پھر گرفتار کر لیا جائے گا اور ساری عمر قید میں رکھا جائے گا۔

اس حلف نامے کو پہلے پڑھ کر سنایا گیا جسے ویڈیو کیمروں میں بھی محفوظ کیا گیا' پھر مجھے دستخط کرنے کو کہا گیا۔ میں نے کاغذ انتہائی غصے سے دور پھینکا اور کہا ''میں مظلوم ہوں، مجرم نہیں ہوں، کبھی بھی اپنا ناکردہ جرم تسلیم نہیں کروں گا، کبھی معافی نہیں مانگوں گا، کبھی بھی اپنی رہائی پر امریکہ کا شکریہ ادا نہیں کروں گا، میں نے کون سا جرم کیا ہے؟ مجھے کس قانون کے تحت مجرم ثابت کیا گیا ہے؟ میں طالب تھا، ہوں اور طالب رہوں گا' البتہ القاعدہ کا کبھی ساتھی نہیں رہا۔ کس دہشت گردی کے واقعے میں میرا ہاتھ تھا مجھے بتایئے، اگر آپ سچے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ اگر آپ نے دستخط نہ کئے تو آپ رہا نہیں ہو سکتے۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا: اگر مجھے ساری عمر بھی قید رکھا جائے پھر بھی یہ نہیں مانوں گا کہ میں مجرم ہوں۔ کئی مرتبہ وہ باہر نکلے پھر اندر آئے۔ کئی بار اصرار کیا مگر میں نے دستخط نہیں کئے۔ چوتھی بار اندر آئے تو کہا کہ اگر آپ کو کاغذ میں لکھی شقیں منظور نہیں تو کچھ اور لکھیں اور وہ لکھیں جو آپ چاہتے ہیں۔ مجبوری کے عالم میں قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا:

''میں مجرم نہیں ہوں، کبھی کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا، ایک مظلوم مسلمان ہوں جس کے ساتھ پاکستان اور امریکہ نے ظلم کیا ہے اور چار سال تک قید میں رکھا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ امریکہ کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ نہیں لوں گا۔ والسلام''

میں نے دستخط کر کے کاغذ ان کے حوالے کر دیا اور گہری سوچوں میں غرق ہو گیا کہ میرا لکھا وہ مانیں گے بھی یا نہیں؟ اور میری تحریر میں وہ کوئی تحریف بھی کر سکتے ہیں۔ بہرحال کچھ دیر بعد ایلچی ریڈ کراس کے نمائندوں کے ساتھ آئے' میرے ساتھ بیٹھے اور رہائی کی خوشخبری دی۔ ریڈ کراس نے اپنے معاملات نمٹا لئے پھر واپس مجھے پانچویں کیمپ لے جایا گیا تاکہ اپنے بھائیوں سے رخصت لے سکوں، سب قیدیوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا تھا، میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا اور ان کے ساتھ ڈیڑھ گھنٹہ گزارا۔ سچی بات یہ ہے کہ اُس وقت مجھے اپنے آپ سے شرم آرہی تھی اس لئے کہ میرے مسلمان بھائیوں نے ابھی مزید عذاب جھیلنا تھے۔ میرے سارے ساتھی میری رہائی پر انتہائی خوش تھے۔ مجھے صرف افغان قیدیوں سے ملاقات کی اجازت دی گئی۔ ایک دن بعد میں کابل کے خواجہ رواش ہوائی اڈے پر اترا۔ مجھے کابل اجنبی اجنبی لگا، جگہ جگہ حفاظتی مورچے بنائے گئے تھے۔ مجھے پہلے سے مقرر کردہ جگہ منتقل کر دیا گیا۔

اب میں پچھلے دس ماہ سے کابل کے اس سرائے میں اہل وعیال کے ساتھ رہائش پذیر ہوں جہاں موجودہ حکومت کی جانب سے کرائے پر رہائش فراہم کی گئی ہے۔ میری حفاظت کا ذمہ حکومت نے ایک سال تک کے لئے لیا ہے۔ ایک سال بعد معلوم نہیں کیا ہوگا؟

تمام مظلوم مسلمان بھائیوں کے لئے دعا گو ہوں کہ ان کو اللہ تعالیٰ بخیر وعافیت تمام مصیبتوں سے اپنی امان میں رکھے اور قیدی بھائی سلامتی کے ساتھ رہائی پائیں۔ اللہ ہمیں آزمائشوں سے بچائے اور ہر امتحان میں سرخرو فرمائے۔ (آمین)